اشارات

شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

کے

مضامینِ نثر کا مجموعہ

نگارستان ایجنسی

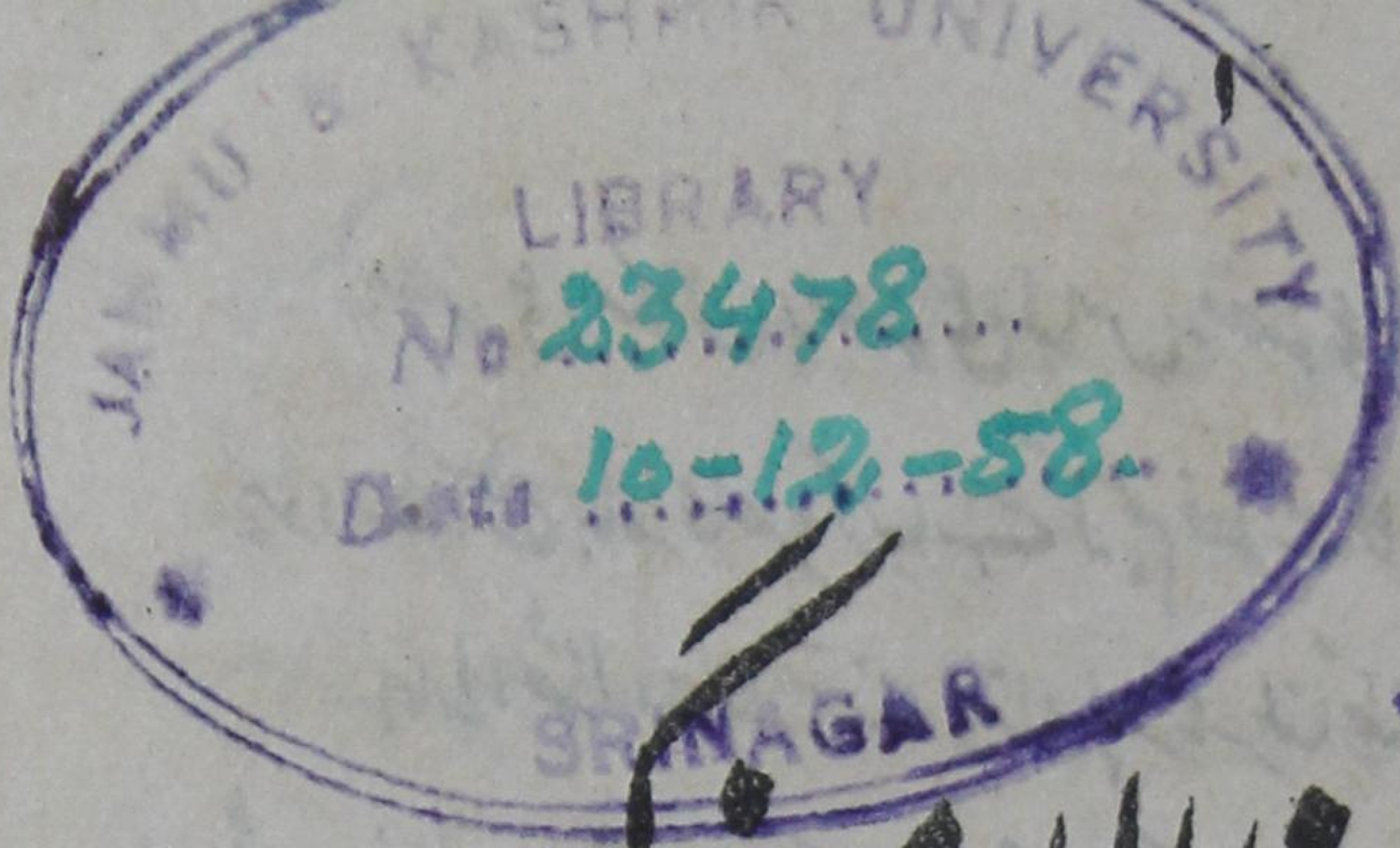
اردو بازار، دلی

بار اول ایک ہزار

قیمت مجلد دو روپے

(آغا سرخوش قزلباش دہلوی نے دیال پریس دلی سے چھپوا کر نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی سے شائع کیا)

فہرست مضامین





تمدن کی ظالمانہ مسخرگی

ہم فطرت سے اِس قدر دور ہو چکے ہیں، اور روز بروز اِس سرعت کے ساتھ دُور ہوتے چلے جارہے ہیں کہ یہ سوچ کر دل پر ایک دہشت سی طاری ہو جاتی ہے کہ آخر انسانیت، فطرت دشمنی کی کس منزل پر جا کر دم لینے والی ہے۔

یہ سچ ہے کہ بدقسمتی سے انسان اب تمدن کے اس نقطہ پر آچکا ہے کہ کامل طور سے فطری زندگی بسر کرنا تقریباً محال ہو چکا ہے لیکن نوعِ انسانی کے ہمدردوں کا یہ فرض ہے کہ وہ مسلسل اِس کی سعی کرتے رہیں کہ اِن حالات میں جس قدر بھی ممکن ہے، انسان فطری سادگی اختیار کر کے فطرت سے قریب تر رہنے کی جانب مائل ہو جائے۔

"فطرت کی طرف واپس چلو" کی آوازیں ہمیشہ لگاتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ تہذیب و تمدن کے رسُوم اور تکلفات کے آداب کو گھٹانا، اور اُن میں ہر امکانی سادگی و بے تکلفی پیدا کرنے کی دھن میں گرداں رہنا ابنِ آدم کے خدمتگزاروں کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

عصرِ حاضر کے تمدن گزیدہ افراد کی زندگی اِس قدر مصنوعی ہو چکی ہے کہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ خود یہ افراد، قانونِ فطرت کے مطابق نہیں، بلکہ مشینوں کی مصنوعی گرمی کے ذریعے سے پیدا کئے گئے ہیں اور "اطفالِ فطرت" ہونے کے عوض فرزندانِ صناعت ہیں۔

مصنوعی مکان، مصنوعی لباس، مصنوعی غذا، مصنوعی پانی، مصنوعی روشنی اور مصنوعی ہوا نے اس طرح ہمارا محاصرہ کرلیا ہے کہ ہم فطرت کا تصور تک نہیں کر سکتے۔

ہمارا اٹھنا، ہمارا بیٹھنا، چلنا، پھرنا، ملنا جلنا، کھانا پینا۔ غرضکہ زندگی کا ہر کام اس قدر بناوٹی اور غیر فطری ہوگیا ہے کہ ہم یہ بھول چکے ہیں کہ حقیقی زندگی بسر کیونکر جا سکتی ہے۔

اس بات پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے کہ تمدن و تہذیب کے شدائد اور آداب و رسوم کے مظالم اب اس قدر ناقابل برداشت حد تک بڑھ گئے ہیں کہ آدمی کو سانس تک لینا دشوار ہو چکا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ ان نامراد آداب و رسوم نے یہاں تک استیلا حاصل کر لیا ہے کہ انسان کے فطری وظائف کے ساتھ ساتھ خود اس کی فطرت کو بھی پابزنجیر بنا دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر محبّت کو لیجیئے۔ ظاہر ہے کہ محبّت نوع انسانی کا وہ سب سے بڑا اور سب سے قوی جذبہ ہے جس کے سامنے تمام جذبات سربسجود نظر آتے ہیں۔

لیکن تہذیب اب اس قدر شوخ چشم ہو چلی ہے کہ وہ انسان کے اس قوی ترین جذبے پر بھی حکمرانی کے خواب دیکھنے لگی ہے۔

دور کیوں جائیے، اپنے بادشاہ سلامت ہی کے معاملے کو دیکھیے۔

بادشاہ سلامت ایک عورت سے، بربنائے محبّت شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اُن کی اس تمنّا پر تہذیب جامے سے باہر ہو گئی۔ آداب و رسوم کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور معاملے نے یہاں تک طول کھینچا کہ بادشاہ کو تاج و تخت سے دست بردار ہو جانا پڑا۔

اس سلسلے میں رسم و رواج اور قانون و ضوابط کے نام سے ایسے ایسے شاہانہ سوال اُٹھائے گئے تھے کہ یا تو اُن پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے یا پھر یہ دل میں آتا ہے کہ اتنے قہقہے مارو کہ پسلیاں دُکھنے

لگیں۔

ظاہر ہے کہ ازدواج و محبت، ایک ایسی ذاتی اور پرائیویٹ چیز ہے جس سے پبلک کیسی محبّت یا شادی کرنے والے کے والدین کو بھی کچھ سروکار نہ رکھنا چاہیئے۔ مگر ہر بیٹھے میں ہاؤس دینے اور ہر دفتر میں نام لکھانے والی شریر سوسائٹی نے اس خالص شخصی و ذاتی معاملے میں بھی اپنے قوانین و آداب ٹھونس کر دم لیا۔

سوسائٹی بھی کتنی تفاوت آمیز شرارت کا نام ہے۔

آج تو صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ بادشاہ کو فلاں سے شادی کرنا، اور فلاں سے نہ کرنا چاہیئے لیکن اگر بیلائے تہذیب کی زُلفیں خدانخواستہ اسی طرح دراز سے دراز تر ہوتی چلی گئیں تو ایک زمانہ وہ بھی آنے والا ہے جب یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ بادشاہ کون سے پھل کھائے۔ اور کون سے نہ کھائے۔ بادشاہ بستر پر کس کروٹ سے سوئے اور کس کروٹ سے نہ سوئے۔ بادشاہ گھر سے نکلتے وقت پہلے داہنا پاؤں اُٹھائے یا بایاں۔ اور بادشاہ سرِ راہ کس چیز کو دیکھے اور کس چیز کو دیکھتے ہی فوراً دونوں آنکھیں بند کرلے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی ایک زبردست شاہی ضابطہ وضع کیا جائے گا۔ جس کی سختی کے ساتھ نگرانی رکھّی جائے گی کہ بادشاہ اگر اثنائے غسل میں برابر "ڈِل ڈُن" "ڈِل ڈُن" نہ پکارتا رہے گا تو اُسے فوراً تخت سے اُتار دیا جائے گا۔ (دیکھیئے کیا کیا مزے آنے والے ہیں)

اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا بھی عبرت آمیز لُطف سے خالی نہ ہوگا کہ شاہی آداب و رسوم نے اس بات کی تو بڑی خندہ پیشانی سے اجازت دیدی تھی کہ بادشاہ اگر چاہے تو اس عورت سے تمام عمر تعلقات رکھ سکتا ہے مگر جہاں تک شادی کا تعلق ہے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ شاہی رسوم و آداب کے تقدّس کی نظر میں بادشاہ اس عورت سے زندگی بھر کے لئے ناجائز تعلقات تو رکھ سکتا تھا، مگر جائز طریقے سے بیوی نہیں بنا سکتا تھا۔ یعنی

طریقے سے بیوی نہیں بنا سکتا تھا۔ یعنی ناجائز تعلقات سے شاہی وقار میں کوئی فرق نہیں آسکتا تھا البتہ جائز تعلقات سے سلطنتِ شاہی کا پرچم سرنگوں ہو جاتا۔

برین عقل و دانش بباید گریست

تاج و تخت سے دست بردار ہو جانا کوئی معمولی دل گردے کا کام نہیں۔ دست بردار شاہنشاہ کی خدمت میں دنیا کے تمام اہلِ دل اور فطرت پرست افراد کو مبارکباد دینا چاہیے کہ انھوں نے جھوٹے رسم و رواج کے خلاف ایک ایسا شاندار احتجاج کیا ہے جسے تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

بادشاہ کی حیثیت ان کی عزت، محض ایک رسمی عزت تھی، لیکن اب ان کے کیریکٹر نے اُن کی ذات میں وہ حقیقی عزت پیدا کر دی کہ صدیاں گزر جائیں گی، لیکن اُن کی عظمت تازہ گری ہوئی شبنم کی طرح ہمیشہ تابناک و تر و تازہ ہی رہے گی۔

زمانہ سب سے زیادہ محبت کی داستانوں کو دُہراتا رہتا ہے۔ چنانچہ جب قریب و دُور کے ملکوں کی سہانی راتیں حسن و عشق کی داستانیں چھیڑیں گی اُس وقت اِس بیسویں صدی کی داستانِ محبت کو سُن کر درد مند دل دھڑکنے لگیں گے اور ایک مرد کی اتنی زبردست قربانی کا تصور عورتوں کے دلوں کو مرد کی عظمت و وفاداری کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دے گا۔

عقل کی باتیں

جب کسی قوم کے دن بُرے آتے ہیں تو وہ عقل کی باتوں پر عمل کرنا چھوڑ دیتی ہے، اور جب قدرت کو یہ منظور ہوتا ہے کہ کوئی جماعت بد سے بدتر ہو جائے تو پھر افراد کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ عقل کی باتوں پر عمل کرنا تو درکنار، وہ عقل کی باتوں سے دُور بھاگنے لگتے ہیں، اور جو شامتِ اعمال سے انہیں عقل کی باتیں سُنانے کی جرأت کرتا ہے، اُس کے دشمن ہو جاتے ہیں، اور جو طبیب کہ ان کے واسطے دوا طیار کرتا ہے، وہ حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ اس کی سند ضبط کر لی جائے۔

ہندوستان "جنت نشان" ماشاءاللہ آج کل اسی منصبِ جلیل پر فائز ہے —— ہندو ہو کہ مُسلم، ایک کو بھی عقل کی کوئی بات نہیں بھاتی۔ ہندو تو کبھی کبھی بھُولے سے ایک آدھ عقل کی بات چلتے چلتے سُن بھی لیتا ہے۔ مگر اللہ سلامت رکھے مسلمان کو، یہ میاں جی تو اتنے دشمنِ عقل ہو چکے ہیں کہ عاقلانہ کلمات کو برداشت ہی نہیں فرما سکتے۔ اِن کا تو خیر سے یہ حال ہے کہ اِدھر عقل کی بات سُنی، اُدھر فوراً مشتعل ہو گئے اور کاٹنے کے لئے دوڑ پڑے۔

معاشری معاملہ ہو کہ معاشی، مذہبی مسئلہ ہو کہ سیاسی، غرضکہ زندگی کے تمام قابلِ توجہ عظیم واہم مسائل کے متعلق ہندیوں کے گودام میں بہت پہلے سے بنے بنائے۔ اور ڈھلے ڈھلائے احکام واصول کے انبار لگے ہوئے ہیں اور وہ ایسے محکم اور اٹل ہیں کہ ترمیم و تنسیخ کیسی، ان میں معمولی سی اصلاح بھی بد سے بدتر سمجھی جاتی ہے۔

جہلا کا ذکر نہیں بڑے بڑے پڑھے لکھوں کا یہ حال ہے کہ جس صحبت میں جائیے، یہی سُننے میں آتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی اس معاملہ میں یہ رائے ہے۔ اور ہمارے پیشوا، اس مسئلے کے متعلق پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے ہیں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ راجعون۔

گویا ہندوستان کے یہ "ہمارے بزرگ" اور یہ "ہمارے پیشوا" حیات کے تمام مسائل کو قیامت تک کے واسطے پہلے ہی سے طے فرما گئے ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کہ اس وقت تک یہ تمام "بزرگ" و "پیشوا" مرنے سے انکار فرماتے رہے جب تک کہ زندگی کے تمام پیچیدہ عقدوں کو بہ تمام و کمال سُلجھا کر انھوں نے یہ اطمینان نہیں کر لیا کہ اب قیامت کے واسطے کوئی ایک بھی ایسا مسئلہ باقی نہیں رہا۔ جس کے طے کرنے کی ہمارے اخلاف کو زحمت برداشت کرنا پڑے گی۔

اِس میں کون شک کر سکتا ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے "بزرگ" و "پیشوا" عجیب و غریب انسان تھے۔ اور وہ ایک ایسا عظیم کارنامہ چھوڑ گئے ہیں جو دیوتاؤں سے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر مذاہب آسمان سے نازل ہوئے ہیں، اور مذاہب کی شریعت خدا کی تصنیف ہے تو ہم ہر قدم پر یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ یہ خدائی شریعت بھی ہر زمانے اور ہر عہد میں ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ مگر رحمت ہو خدا کی "ہندیوں کے بزرگوں اور پیشواؤں" پر کہ وہ ہر مسئلہ کا ایک ایسا ابدی فیصلہ کر چکے ہیں جو قیامت تک تبدیل نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کی اِس اندھیر نگری میں کس کے سامنے سر پھوڑا جائے اور کس اللہ کے بندے کو یہ موٹی سی بات سمجھائی جائے کہ بابا عالم کے ہر خشک و تر اور دنیا کے ہر ذی رُوح و غیر ذی رُوح وجود کی طرح انسان بھی ہر آن، ہر ساعت، ہر لمحہ اور ہر نفس برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے اس کے یہاں پل بھر کے لئے بھی سکون نہیں۔ بلکہ ایک مسلسل حرکت اور ایک پیہم تغیر و انقلاب ہے

جو ازل سے کارفرمائی کر رہا ہے۔ اور ابد تک سرگرم کار رہے گا۔ جب یہ عالم ہے تو ایک آن بدلنے والی مخلوق کے لئے کوئی ایسا ضابطہ وضع ہی نہیں کیا جا سکتا جو قیامت تک اسی کا ساتھ دے سکتا ہو؟

چلتی ہوئی ریل کا چلتی ہوئی روشنی ہی ساتھ دے سکتی ہے۔ قائم و ساکن روشنی اُسے فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

یہاں تک لکھنے کو تو لکھ گیا۔ اب اس کے آگے کیا لکھوں۔ تصوّر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ قدامت پرستی اور اوہام نوازی کے ماتھے پر لانبی اور گہری شکنیں پڑ رہی ہیں۔ اور مقلدینِ کرام کے چہروں پر ایک ایسی تُرشی آ گئی ہے کہ اگر اُن کے خشونت آمیز خدوخال کو نچوڑ دیا جائے تو کھٹے لیموں کا عرق شرم سے آب آب ہو کر رہ جائے۔

لیکن میں سچّی بات کہوں گا۔ اور دُنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہوں گا۔

ہاں تو جب یہ ایک حقیقت مُسلّمہ ہے کہ ایک ہر آن بدلنے والی مخلوق کے واسطے ایک ایسا قانون وضع ہی نہیں کیا جا سکتا، جو ہر زمانے، ہر صدی اور ارتقاء کی ہر منزل میں ساتھ دے سکتا ہو، تو للّٰہ خود اپنے پر اور اپنی آئندہ نسلوں پر رحم کرو۔ اور اپنے "بزرگوں" اور "پیشواؤں" کے صدیوں پیشتر کے وضع کردہ احکام و اصول سے نجات حاصل کر کے عصرِ حاضر کے مقتضیات و ضروریات پر غائر نگاہ ڈالو، اور اپنی جسمانی و ذہنی توانائی کی خاطر ایک ایسا شائستہ، معقول اور تندرست ضابطۂ حیات مُرتب کرو جو اس بیسویں صدی میں تمہارے کام آ سکے۔

اگر تم نے وقت کی یہ سب سے ضروری بات نہ سُنی تو یاد رکھو تم یونہیں زمانے کی شکایتیں اور تقدیر کے شکوے کرتے کرتے مر جاؤ گے۔ اور تمہاری موت ایک ایسی بدنام موت ہو گی، جو ہمیشہ خودکشی کرنے والوں کے حصے میں آیا کرتی ہے۔

زمانے کی شکایتیں کرنے، اور روزگار کو پانی پی پی کر کوسنے والے، لگے ہاتھوں یہ بھی سن لو کہ زمانہ کبھی اچھا یا بُرا نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ یہ افراد ہیں، جو زمانے کو اچھا یا برا کہا کرتے ہیں ــــ جو لوگ خود اچھے ہوتے ہیں وہ زمانہ کو اچھا اور جو خود بُرے ہوتے ہیں، وہ زمانے کو بُرا کہتے ہیں۔

اچھے وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے عہد کی نبض دیکھنا اور اپنے عصر کے قلب کی ضربیں شمار کرنا آتا ہے۔ اور بُرے وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں زمانے کو گالیاں دینے کے علاوہ، ان دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں آتی۔

ایک بار پھر سنو اور غور سے سنو کہ تمہارے دماغوں پر تقلید و اوہام کی برف جمی ہوئی ہے تمہاری ذہنی فضا میں بوسیدہ روایات کا غلیظ دھواں گھُٹا ہوا ہے اور تمہارے نفوس کے گرد، قدامت پرستی کی کائی سے ڈھکی ہوئی سر بفلک دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔

اب بھی سویرا ہے، خدا کے واسطے چونکو، اٹھو اور پھُرپری لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ تقلید و اوہام کی برف کو آزاد اندیشی کے تیشے سے کاٹ ڈالو، روایات کے دھوئیں کو صحیح تفکر کی تند ہواؤں میں اڑادو اور قدامت پرستی کی دیواروں کو روشن خیالی کی توپوں سے مسمار کر ڈالو۔

یاد رکھو جب تک کسی قوم کا ذہن، تندرست، قوی اور جوان نہیں ہوتا، اور جب تک کسی جماعت کی عقل کھلی ہوئی ہوا میں سانس نہیں لے سکتی اُس وقت تک اُس کے سر پر زندگی کا آفتاب نہیں چمک سکتا۔ اور اگر چمک سکتا ہے تو جب تک کسی قوم یا جماعت میں اس کی ضو فشانیاں اور حیات بخش قوتوں کے قبول کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کی اہلیت موجود نہ ہو، بیکار ثابت ہوتا ہے جیسے کسی پتھریلی اور چٹیل زمین پر دانہ پھینکنا خود اس دانے کی ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

ــــــــ

کھرے کھوٹے کی پہچان

خوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں
تا سیہ رُوئے شود ہر کہ درو غش باشد

ہمارے شعراء نہ تو ادیب معلوم ہوتے ہیں، نہ شاعر — شاعر، جس ملک، اور جس قوم کا بھی ہو، شائستہ ترین انسان ہوا کرتا ہے۔ میرا مُدعا یہ ہے کہ شاعر اپنی فطرت کی رُو سے بہترین انسان ہونے کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

لیکن یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہمارے "شعراء" اس کے بالکل برعکس واقع ہوئے ہیں۔ کیا ہندوستان کے "شعراء" کی تخلیق کے وقت، قدرت کی خوش مزاقی مفلوج، اور سُنتِ الٰہی معطل ہو چکی تھی۔

جس قوم کے شاعر کی سیرت کا مطالعہ کیجئے۔ شروع سے آخر تک آپ کو شرافت، خلوص لطافت، بلند ہمتی، عالی ظرفی، پاکیزگی، محبت، اور خوش خلقی کے سوا کوئی ایک چیز بھی ایسی نہ ملے گی جس سے آپ کے جمالیاتی احساس کو ٹھیس لگ سکے۔

لیکن اس ہندوستان میں اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ یہاں کا "شاعر" چڑچڑا۔ بد خلق، لاف زن، کینہ پرور، بد گمان۔ غیر مخلص، پست ہمت۔ سرد مہر اور احسان فراموش ہوتا ہے — یہ ذرا سی بات پر بازاری آدمیوں کی طرح رُوٹھ جاتا ہے، مشاعروں میں اگر ترتیب نشست ذرا لمحوظ

کے سلسلے میں اِسے کوئی ادنیٰ سی بات بھی ناگوار گزرتی ہے تو یہ بھری محفل میں چیخنے لگتا ہے
محفل سے باہر نکل جاتا ہے، اور منانے والوں کے حلقے میں ایک مست ہاتھی کی طرح غصّے
میں پیٹ ہلاتا نظر آتا ہے ـــــ یہ اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بھی "انسان"
نظر نہیں آتا۔ اُس وقت بھی "شاعر" ہی بنے رہنے پر مصر رہتا ہے ـــــ بات کرتا ہے تو
بڑے ٹھسّے سے۔ داد دیتا ہے تو بڑے غرور کے ساتھ، اُٹھتا ہے تو جسم کی ایک خاص مصنوعی
صلابت سے، بیٹھتا ہے تو ایک مخصوص دَھج سے اور چلتا ہے تو ایسے ٹھاٹھ کے ساتھ
گویا خدا اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے ـــــ احسان فراموش اتنے پرلے درجے کا ہوتا ہے
کہ آپ تمام عمر اِس پر احسان کرتے رہیں، لیکن ایک دن بھی آپ نے اِس کے لہک لہک کر
غزل پڑھنے پر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے "واہ واہ" کے نعرے نہ مارے، تو بس اسی
وقت آپ کے تمام احسانات ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ آپ سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

اِس پر صحیح اور بے لاگ تنقید، یا اعتراض کرنا تو بڑی بات ہے اگر اِس کے "بلاغت نظام"
کلام پر بُھولے سے آپ نے کسی دوسرے کی بے لاگ تنقید بھی شائع کر دی تو بس یہ دو دو گز
اُچھلنے لگتا ہے، اِس کے مُنہ سے جھاگ اُڑنے لگتے ہیں یہ اوباش اونٹوں کی طرح بلبلاتا
ہے، اور بدچلن گھوڑوں کی طرح ہنہنا کر ٹاپیں مارنے لگتا ہے۔

اِس کی، اور سانپ کی خاصیت ایک ہوتی ہے۔ یعنی اِدھر کسی کا پاؤں دھوکے سے اُس
کی دُم پر پڑا، اِدھر فوراً ہی اُس نے مُڑ کر کاٹ لیا۔

خیر، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ـــــ ذکر تو یہ ہو رہا تھا کہ ہندوستان کا شاعر بہت ہی پست
ذہنیت رکھتا ہے۔ اور اُسی کے ساتھ اِس بات پر استعجاب کا اظہار کیا جا رہا تھا ـــــ جو رسیدگی
و ثقافت (Culture) کے نقطۂ کمال پر جلوہ گر ہوتا ہے، اُس سے کوئی کیا اب، یا

بازاری حرکت ہو کیونکر سکتی ہے ؟

کیا کبھی سننے میں آیا ہے کہ کسی ہرن نے درندوں کی طرح کسی جانور کو پھاڑ کھایا ہو ؟ اور اگر آپ کے سامنے کوئی ہرن، درندوں کی طرح حملہ کرنے لگے تو کیا آپ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ یا تو یہ قدرت کا کوئی ناقابلِ فہم کرشمہ ہے۔ یا پھر معاملہ یہ ہے کہ کسی غیر شاعر نے حقیقی شاعر کا روپ بھر لیا ہے، تاکہ بہت سے شاعر بناکر اور اُجرت کی غزلیں کہہ کر اپنا پیٹ بھر سکے۔

میری اِس تمام خامہ فرسائی کا مُدعا اور مقصد صرف اس قدر ہے کہ اپنے اربابِ وطن کو یہ سمجھا دوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ہندوستانی اشیا رافراد کی صحیح قدر و قیمت اور ان میں تفریق و امتیاز کا اپنے میں سلیقہ پیدا کریں اور خصوصیت کے ساتھ ہماری ادبی دُنیا کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ادیب کیا ہوتا ہے اور شاعر کسے کہتے ہیں۔ کیونکہ

مِل گئی جس کو گانٹھ ہلدی کی   وہ سمجھتا ہے بس ہوں پنساری

کا زمانہ باقی نہیں رہا ہے۔

یہ سچ ہے، جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ شاعر، موزوں طبع ہوتا ہے، لیکن یہ اس سے بھی زیادہ سچ ہے کہ ہر موزوں طبع شاعر نہیں ہوا کرتا۔ خواہ وہ دس ہزار دیوانوں کا مُصنّف ہی کیوں نہ ہو۔ اور خواہ وہ فی منٹ پچاس ہزار شعر ہی کیوں نہ کہتا ہو اور خواہ تمام دنیا کے ناپختہ امارد کا وہ اُستاد ہی کیوں نہ ہو۔ اِس لئے ہندوستان کی ادبی فضا کو صاف کرنے اور گمراہیوں کو مٹانے کی خاطر ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے "شعرا" کی فطرت و سیرت کا غائر مطالعہ کر کے یہ بہت جلد معلوم کر لیں کہ ان میں سے کتنے حقیقی شاعر ہیں اور کتنے مصنوعی۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اتنی طوالت کی کیا ضرورت ہے، تمام شعراء کا کلام ہمارے سامنے ہے۔ ہم ان کے کلام کا غائر مطالعہ کر کے اُن کے باب میں حقیقی و مصنوعی شاعر ہونے کا اندازہ

لگا سکتے ہیں۔

میں اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ یہ کام نہایت ہی خطرناک ہے اور اس عہد میں خطرناک تر ہو چکا ہے —— آپ کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں ہر روز کتنے جھوٹے سکے ڈھالے، اور کتنے جھوٹے نگینے تراشے جاتے ہیں۔ اور وہ اصل کی ایسی کامیاب نقل ہوتے ہیں کہ کھوٹے کھرے میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا —— آج کل مصنوعی شعراء کا بھی یہی حال ہے، ان حضرات نے برسوں کی مسلسل مشق و مزاولت سے اس قدر استعداد بہم پہنچائی ہے کہ دوسروں کی اعلیٰ شاعری کو سامنے رکھ کر اس کی ایسی نقل اُتار لیتے ہیں کہ بعض اوقات تو خواص تک کو تھوڑی دیر کے لئے یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ وہ حقیقی شاعر ہیں۔

اس لئے سب سے زیادہ محفوظ اور بےخطا طریقہ یہی ہے کہ تمام مشہور شعراء کی زندگی، فطرت، سیرت اور عادات و اطوار کا غائر مطالعہ کیا جائے اور اُسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ اُن کی ابتدائی زندگی کن مشاغل میں گزری ہے، اُس عہد کے اہم واقعات کیا ہیں، نیز سوسائٹی، وطن، ہمسایوں کی اُن کے کردار کے متعلق کیا رائے ہے؟ اور جب یہ تحقیقات مکمل ہو جائے تو ملک اپنا فیصلہ سُنا دے کہ فلاں سچا شاعر ہے، اور فلاں جھوٹا۔

آپ شاید اس مشورے کو ایک ادبی تفریح، یا شاعرانہ مشغلہ سمجھتے ہوں گے حالانکہ یہ اس قدر ضروری کام ہے کہ اگر انجام پا گیا، تو در اصل اس عہد کا ایک نہایت ہی درخشاں کارنامہ ثابت ہوگا۔

آپ ممکن ہے دریافت فرمائیں کہ اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ سُنئے، اس وقت سرسری طور سے اس کے جو فوائد میرے ذہن میں آ رہے ہیں انھیں عرض کئے دیتا ہوں۔

(۱) ادبی دنیا کو کھوٹے کھرے کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔ جس سے ملک کی ادبی ذہنی

زندگی پر نہایت مفید اثر پڑے گا۔

(۲) جو لوگ کہ مصنوعی شعراء کی اس وقت تقلید کر رہے ہیں وہ اپنی غلطی سے آگاہ ہو کر راہِ راست پر آجائیں گے، اور اُن کا ادبی دماغی مستقبل خطروں سے محفوظ ہو کر صحیح راستہ پر گامزن ہو جائے گا۔

(۳) اُن جھوٹے شعراء کے جو بے شمار شاگرد ہیں، وہ ذہنی گمراہی اور فیس کی فرمائشوں کے بارے بچ جائیں گے (واضح رہے کہ جھوٹا شاعر، شاگرد بنانے کا بہت ہی سخت حریص ہوا کرتا ہے، اور فرطِ بزدلی سے اکثر شاگردوں ہی کے کاندھے پر رکھ کر بندوق چھوڑتا ہے۔)

(۴) رسائل و اخبارات کا راستہ صاف ہو جائے گا۔

(۵) نیندیں حرام کرنے والے اور نجوبی انجمنوں پر فضول کرائے وغیرہ کا بار ڈالنے والے مشاعروں کا تن و توش گھٹ جائے گا۔

(۶) اور سب سے بڑا فائدہ یہ پہونچے گا کہ اِن جھوٹے شاعروں کے جھوٹے لٹریچر سے، خصوصیت کے ساتھ تعلیم یافتوں اور نوجوانوں کو جو سیاسی، ادبی، ذہنی اور معاشری نقصان مدّت دراز سے پہونچتا چلا آرہا ہے۔ اُس کا سدِّباب ہو جائے گا۔

ایک مکالمہ

صغیر۔ جب دیکھیے آپ ہندو مسلم اتحاد ہی کے خواب دیکھتے ہیں۔

کبیر۔ تو کیا ہندو مسلم نفاق کے خواب دیکھا کروں؟

صغیر۔ آپ تو شدّت کے ساتھ جذباتی قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں آپ ہندو کو نہیں پہچانتے۔

کبیر۔ ہندو مسلم اتحاد ایک خواب ہے، جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ آپ ہندوؤں سے ناراض کیوں ہیں؟ اس زمانے میں جو ہندو مسلم کشاکش ہے، اس پر نہ جائیے۔ اُن کی بنیاد سخت کھوکھلی ہے، اور یہ ابرِ غلیظ بہت جلد چھٹ جائے گا، کل یہی ہندو مسلم شیر و شکر تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور دو شریف بھائیوں کی طرح دوش بدوش زندگی بسر کرتے تھے۔ آج اِن میں جو آویزش نظر آ رہی ہے۔ اس کے لم سے آپ بھی واقف ہیں۔ اور میں بھی ——— کیونکہ جب قدرت دو گروہوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہتی ہے تو اُن کے درمیان آویزشیں شروع ہو جاتی ہیں۔

میں تو اِس جنگ کو مستقل صلح کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔ کیا آپ نے نہیں سُنا؟

خانہ جنگی غسلِ صحت ہے علیل اقوام کا! ہندو مسلم نزاع کو فالِ بد سمجھیے، اس لیے میرا تو اعتقاد ہے کہ :-

خاک پر بہتے ہی دونوں کا لہو مل جائے گا۔

صغیر۔ جناب کو ہندو کا تجربہ نہیں ہے۔ میں کامل بارہ سال تک کورٹ آف وارڈس کے سلسلے میں اِن حضرات کا تجربہ کر چکا ہوں۔ اِن ہنود کے عادات و خصائل سے میں بخوبی واقف ہوں، خدا کی پناہ، اِن کا تعصّب اور اِن کی ہٹ دھرمی اپنا جواب نہیں رکھتی۔

کبیر۔ کیا مُسلمان متعصب اور ہٹ دھرم نہیں ہے؟

صغیر۔ ہرگز نہیں۔ مسلمان، ایک شریف اور بھولی قوم ہے؟

کبیر۔ بھولی ممکن ہے بعض حیثیتوں سے ہو، مگر کیا کوئی شریف قوم متعصّب۔ بد معاملہ بددیانت حاسد، عیب جُو، دروغ گو، اور غدارِ وطن ہو سکتی ہے۔ اور کیا شرفا ایک دوسرے کو گالیاں دیا کرتے ہیں؟

صغیر۔ یوں تو ہر قوم میں اچھے بُرے افراد ہوتے ہیں۔ مگر ہندو تو اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔

کبیر۔ یہ آپ کس بنیاد پر فرماتے ہیں؟

صغیر۔ میں اِس بنیاد پر کہتا ہوں کہ اوّل ہندو کا مذہب جسے وہ نہایت قدیم فلسفہ کہہ کر اپنا جی خوش کر لیا کرتا تھا، سخت بے بنیاد اور مبنی بر اوہام مذہب ہے۔ دوسرے ہزاروں برس کی غلامی نے اِس کی ذہنیت کو شرمناک حد تک پست کر دیا ہے، تیسرے روپے پیسے پر جان دینے کے باعث یہ اِس قدر اندھا ہو چکا ہے کہ اس میں آدمیت اور بالخصوص انسانی ہمدردی باقی نہیں رہی ہے یہ زندگی کی ہر معاملت میں ڈنڈی مار دینے ہی کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتا ہے۔

کبیر۔ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اگر اسے حرف بحرف صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم ہندو سے نفرت کرنے لگیں؟۔ اگر ہمارا کوئی بھائی علیل ہے، تو ہم اس کی دوا کریں گے، یا اُس کی دشمنی پر کمر باندھ لیں گے؟

صغیر۔ جناب میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی پست ذہنیت والی قوم شریفانہ اور عادلانہ برتاؤ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔

کبیر۔ میں اس کے جواب میں بھی یہی عرض کروں گا کہ اگر آپ کا بیان صحیح ہے تو آپ اصلاح کی کوشش کریں۔

کیا ہمارے اظہارِ نفرت سے ہندو کے امراض کا ازالہ ہو جائیگا؟ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی غور کیجئے کہ معائب کی دوڑ میں مسلمان ہندو سے پیچھے ہیں کہ آگے یا برابر؟ ہندو نے ہزاروں برس کی غلامی سے جو معائب اپنے گرد و پیش جمع کر لئے ہیں، کیا وہ تمام معائب مسلمان نے صرف ڈیڑھ سو برس کی غلامی میں اپنی سرشت میں داخل نہیں کر لئے ہیں؟ وہ کونسا غلامانہ عیب ہے جو ہندوؤں میں ہے اور مسلمانوں میں نہیں؟ جب حمام میں دونوں ہی ننگے ہیں، تو ایک ننگے کو دوسرے سے یہ کہنے کا حق کہاں سے پہونچتا ہے کہ دیکھو او بے حیا تو ننگا ہے؟

صغیر۔ بھائی صاحب! ہندو ہمیں "ملیچھ" یعنی ناپاک سمجھتے ہیں اور ہمارے ساتھ کھانا، پینا کیسا، اگر اُن کے کھانے پر ہماری پرچھائیں بھی پڑ جائے تو وہ اس کھانے کو نجس سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔

کبیر۔ اپنے سے ہندوؤں کی اِس چھوت چھات کو آپ قومی منافرت کیوں سمجھتے ہیں؟۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خود اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ اس باب میں اُن کا برتاؤ کس قدر سخت ہے، یہ لاکھوں ہریجن آخر کس کے مارے ہوئے ہیں؟ —— ہریجنوں کا رونا کیا رویا جائے خود اُن کے گھروں میں اُن کا یہ برتاؤ ہے، کہ بھائی بھائی، بیوی، میاں کو اور باپ بیٹے کو ناپاک سمجھتا اور ایک دوسرے کے ساتھ کھانے پینے کو حرام جانتا ہے۔

اگر ہندو کا برتاؤ اپنے ہم مذہبوں، اور اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ کچھ اور ہوتا، اور آپ کے ساتھ کچھ اور، تو بیشک آپ کو یہ کہنے کا حق تھا کہ ہندو ہم سے از راہِ تعصب و عناد چھوت کا برتاؤ کرتا ہے مگر وہاں تو:-

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بما کُنی نظیری کا معاملہ ہے۔

آپ اس چھوت چھات کو دیکھ کر یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہندوؤں کی یہ روش نہایت ہی مذموم ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکال سکتے کہ اُن کا یہ برتاؤ آپ کی دشمنی پر مبنی ہے۔

صغیر۔ بھائی صاحب! آپ کو دفاترِ سرکاری کا حال نہیں معلوم کہ ہندوؤں نے وہاں مسلمانوں کے خلاف کیا قیامت برپا کر رکھی ہے...... وہاں مسلمانوں کو ایک ایک کر کے نکالا جاتا ہے اور چھانٹ چھانٹ کر ہندوؤں کو بھرا جاتا ہے۔

کبیر۔ مجھے سرکاری دفاتر کا بطورِ خود کوئی تجربہ نہیں۔ ہاں مسلمانوں سے یہ شکایت بارہا سُن چکا ہوں کہ ہندو اُن کی عافیت سے تنگ کیسے رہتے ہیں

اگر صورتِ حال یہی ہے جو آپ نے بیان فرمائی ہے اور میں بھی بارہا سُن چکا ہوں، تو میں افسوس کے ساتھ ہندوؤں کی زیادتی کو مانوں گا اور اُنھیں ایک بھائی کی طرح مشورہ دوں گا کہ وہ اس ظالمانہ اور اُس کے ساتھ ساتھ غیر عاقلانہ برتاؤ سے باز آئیں۔

مگر برادرِ من، یقین رکھئے کہ یہ صرف ضد کی بات ہے، اور یہ ضد فریقین کے غلط برتاؤ نیز زمانہ حاضر کی پوشیدہ پالیسی کی پیداوار ہے، جو زیادہ مدت تک زندہ نہیں رہ سکتی۔

صغیر۔ ,,فریقین کے غلط برتاؤ،، سے آپ کا کیا مقصد ہے؟

کبیر۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اس وقت بعض اُمور میں مسلمان، ہندوؤں کے ساتھ ہٹ دھرمی کر رہے ہیں اور بعض میں ہندو مسلمانوں سے غیر منصفانہ برتاؤ کر رہے ہیں۔

صغیر۔ مسلمان کس بات میں ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔؟

کبیر۔ پہلے ہندوؤں کی ہٹ دھرمی سُن لیجیے، پھر مسلمانوں کی ہٹ دھرمی بتاؤں گا۔

ایک ہٹ دھرمی تو ہندوؤں کی یہی ہے کہ وہ سرکاری دفاتر میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے ہیں۔

دوسری ہٹ دھرمی یہ ہے کہ وہ ہندو مُسلم اتحاد کی سب سے بڑی اور مقدس یادگار یعنی اُردو زبان کو نیست و نابود کر دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔

تیسری یہ ہے کہ ہر بڑے شہر میں گوروں کی خاطر ہزاروں گائیں روز ذبح کی جاتی ہیں جس پر ہندو چوں نہیں کرتے لیکن اگر بقرعید کے موقع پر ایک گائے بھی مسلمان ذبح کر دیتے ہیں تو اُس کے حلیتوں ہندو سینکڑوں مسلمانوں کو ذبح کر ڈالنے پر تُل جاتے ہیں۔

صغیر۔ مرحبا، آپ نے کس قدر صفائی کے ساتھ امرِ حق کو ظاہر کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ہندوؤں کو اس قدر سمجھتے ہیں؟

کبیر۔ مگر مجھ سے یہ بھی پوچھیے کہ مسلمانوں کو کس قدر سمجھتا ہوں۔ بھائی صاحب، بُرا ماننے کی شرط نہیں ہے ـــ اب ذرا مسلمانوں کی ہٹ دھرمیاں بھی سُن لیجیے

صغیر مُسلمانوں کی ہٹ دھرمیاں!

کبیر۔ جی ہاں مسلمانوں کی ہٹ دھرمیاں۔

صغیر۔ سنائیے جناب۔

کبیر۔ پہلی ہٹ دھرمی تو مسلمانوں کی یہ ہے کہ وہ بقرعید کے موقع پر محض ہندو آزاری کی خاطر گائے ذبح کرتے ہیں۔

حالانکہ اسلام اُنھیں ہرگز گائے کی قربانی پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اگر اسلام کی رُوح کا غائر

مطالعہ کیا جائے تو یہ بآسانی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اِن حالات میں اور ہندوستان کے سے ملک کے اندر گائے کی قربانی قطعاً نامناسب ہے

دوسری ہٹ دھرمی یہ ہے کہ وہ قربانی کی گائے کو آراستہ کرکے ڈھول تاشوں کے ساتھ گلیوں گلیوں پھراتے ہیں تاکہ ہندوؤں کے دل مجروح ہوں اور اُن کے جذبات میں اشتعال پیدا ہو۔

تیسری ہٹ دھرمی یہ ہے کہ ہندوستان میں کئی پشتوں کے گزر جانے کے باوجود اور ہندو خون کے مخلوط ہو جانے کے باوصف وہ ہندوستان کو اب تک اپنا وطن نہیں سمجھتے ان کا دل اسلامی ممالک کے طواف کرتا رہتا ہے، وہ ترکوں، عربوں، ایرانیوں اور افغانیوں، سے جس قدر محبت رکھتے ہیں اس کی آدھی محبت بھی اپنے ہندوستانی بھائیوں سے نہیں کرتے حالانکہ ترک وعرب وغیرہ انھیں منہ بھی نہیں لگاتے، اور انھوں نے آج تک ان کی ایک موقع پر بھی کوئی مدد نہیں کی، پھر بھی یہ اُنھیں کے پیچھے دوڑا کرتے ہیں۔

چوتھی ہٹ دھرمی یہ ہے کہ وہ مسجدوں کے سامنے ہندوؤں کو باجا بجانے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور اُس کی یہ مہمل ومفسدانہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ باجہ کی آواز سے ہماری نمازوں میں خلل، واقع ہوتا ہے۔

حالانکہ کثرت سے ایسی مسجدیں ہیں جو ریلوے اسٹیشنوں اور شہروں کے گنجان وپُرشور بازاروں کے اندر واقع ہوئی ہیں، جن کے آگے پیچھے، اور داہنے بائیں انجنوں کی سیٹیاں شور کرتی یا ریلیں گھڑگھڑاتی، اور ٹرام کاریں کھڑکھڑاتی رہتی ہیں، لیکن اِن تمام غیر موسیقانہ اور روح فرسا ہنگاموں سے اُن کی نمازوں میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اور خلل واقع ہوتا ہے تو صرف ہندوؤں کے باجوں سے، جو موسیقی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور جن کی آواز خضوع وخشوع

میں اضافہ کرسکتی ہے

پانچویں ہٹ دھرمی یہ ہے کہ مسجد کے سامنے سے اگر مسلمانوں کی شادی کا کوئی جلوس باجا بجاتا ہوا نکل جائے تو اُس سے نماز میں قطعی کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ لیکن اگر بدقسمتی سے ہندوؤں کا کوئی جلوس باجا بجاتا ہوا گزرے تو ان کی نمازیں فاسد اور اُن کے وضو شکست ہوجاتے ہیں۔

صغیر۔ اِس چوتھی ہٹ دھرمی کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟

کبیر۔ دُور کیوں جائیے، کل ہی کی شادی کے باجوں کو یاد کیجئے۔ آپ میرے ساتھ تھے کہ نہیں؟

صغیر۔ ہاں تھا۔

کبیر۔ تو کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ عین مسجد کے دروازے کے سامنے باجہ بج رہا تھا، اور موذن مغرب کی اذان کہنے کے لئے کانوں میں اُنگلیاں دیئے اِس انتظار میں کھڑا تھا، کہ باجا رُکے تو میں اذان کہوں؟

صغیر۔ جناب، کانگریس بڑی قومی جماعت بنتی ہے گزشتہ سال میں لکھنؤ آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں خود شریک تھا، اور ہر طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کانگریس کے پنڈال یا پنڈال کے گرد و پیش کی دوکانوں پر کہیں کوئی بورڈ اُردو میں ہے کہ نہیں مگر مجھے ہندی کے علاوہ اُردو کا ایک حرف بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہندو دراصل ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا چاہتے، اور ہماری زبان، ہماری معاشرت اور ہمارے وجود کو فنا کردینے پر تُلے ہوئے ہیں۔

کبیر۔ کانگریس میں اُردو کے بائیکاٹ کی شکایت میں نے بھی سُنی ہے اور میں اِسے

تسلیم کرتا ہوں کہ اکثر ہندو یہی چاہتے ہیں جو آپ نے فرمایا ہے، کوئی شک نہیں کہ وہ ہندو جو ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے اور مسلمانوں کے فنا کردینے پر تلے ہوئے ہیں نہایت ہی قابلِ ملامت ہیں۔ صرف قابلِ ملامت ہی نہیں سخت غیر دانشمند بھی واقع ہوئے ہیں

لیکن صغیر صاحب! جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ محض وقتی جذبوں، اور ہنگامی اشتعال انگیزیوں کے نتائج ہیں، فضا بدلتے ہی یہ تمام اُمور خواب و خیال ہو کر رہ جائیں گے

کیا آپکو نہیں معلوم کہ بعض عاقبت نااندیش مسلمان بھی ہندوستان میں دوبارہ مغل شاہنشاہی قائم کرنے کے خواب دیکھتے، اور اس ملک میں کسی "پاکستان" کے واسطے کوئی گوشہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟ حالانکہ اگر غور سے دیکھئے تو دونوں غلطی پر ہیں۔

مسلمان جب اُس ملک کے شہنشاہ تھے اور اُن کے جبروت کا پرچم تمام ہندوستان پر لہرا رہا تھا، اُس وقت تو ہندوؤں کو، جو اُن کی خوف زدہ رعایا میں سے تھے، فنا نہ کر سکے، تو اب اس محکومی و ناطاقتی کے زمانے میں کیا خاک فنا کر سکیں گے۔

اور ہندو جب کہ اُن کے بڑے رجواڑے برسرِ اقتدار تھے، اور اُن کے راجپوتوں کی مونچھوں سے چنگاریاں اڑتی تھیں۔ مٹھی بھر مسلمانوں کو مغلوب نہ کر سکے، تو اب یہ سات کروڑ مسلمانوں کو کس برتے پر فنا کر سکیں گے؟

صغیر۔ جناب کی اِس ہی گفتگو کے اندر میرا جواب مضمر ہے۔ جس طرح کل مٹھی بھر مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کر لیا تھا، آج بھی وہ ایسا ہی کر سکتے ہیں۔

کبیر۔ اوّل تو اِس کا جواب مغل سلطنت کے ختم ہو جانے ہی میں پوشیدہ ہے۔

دوسرے اب نہ ہندوستان کے وہ سیاسی حالات ہیں، اور نہ مسلمانوں میں وہ دم ہی باقی ہے کہ بادشاہی کا خواب دیکھ سکیں۔

صغیر۔ کیوں نہیں، مسلمانوں میں تو آج بھی ایمان کی وہ آگ ہے جو تمام عالم کو خاکستر کر سکتی ہے

کبیر۔ ایمان؟ اور ایمان کی آگ؟ اور پھر ہندوستانی مسلمانوں میں۔ آپ جاگ رہے ہیں کہ سوتے ہیں؟ یہ آئے دن عدالتوں میں جھوٹے حلف اُٹھانے والے، یہ عبائیں زیب و وش کر کے مالِ وقف ھضم کرنے والے یہ آپس میں ایک دوسرے کی جان و آبرو لینے والے، یہ داڑھیوں کی آڑ میں شکار کھیلنے والے، یہ شب براتوں میں آتش بازیاں چھوڑنے والے، یہ محرم میں تابوت نکال کر چھاتیاں پیٹنے والے، یہ سڑکوں پر مدح صحابہ کے نعرے لگانے والے، یہ بازوؤں پر تعویذ باندھنے والے، یہ فاتحہ کا نان و حلوے کھانے، قبروں پر سجدہ کرنے، غیر اللہ سے استعانت طلب کرنے، اور عُرسوں میں ناچنے والے مُسلمان صاحبِ ایمان ہیں؟ اگر ایمان یہی ہے تو خدارا بتایئے کفر کسے کہتے ہیں۔

کیا یہی ایمان ناشناس نازک اندامانِ ملک ہندوستان پر دوبارہ اپنا پرچم اڑائیں گے؟

ایں خیال است و محال است و جنوں!

صغیر۔ دیکھئے میں پھر آپ سے کہتا ہوں کہ آپ مسلمانوں کو اس قدر ٹھنڈا نہ سمجھیں، اور ہندوؤں سے اس قدر خوش اعتقادی نہ رکھیں ورنہ آپکو پچھتانا پڑے گا۔

کبیر۔ مسلمانوں کو ٹھنڈا نہ سمجھوں کیونکر ٹھنڈا نہ سمجھوں، میں تو جس مسلمان کے سینے پر ہاتھ رکھتا ہوں برف کا سا چپکا لگتا ہے، آپ دُھواں دیکھ کر مسلمان کو آگ سمجھتے ہیں، بھائی صاحب یہ آگ کا نہیں برف کا دھواں ہے، رہی یہ بات کہ میں ہندوؤں سے خوش اعتقادی نہ رکھوں، لیکن یہ تو بتلایئے کہ میری کس بات پر آپ کو خوش اعتقادی کا گمان ہوا؟

خیر خوش اعتقادی کی بحث تو جانے ہی دیجئے، میں مانے لیتا ہوں کہ ہندو بُرے، اور اس سے زیادہ بُرے ہیں، جتنا آپ سمجھتے ہیں لیکن خدا کے واسطے یہ تو سوچئے کہ کرنا کیا چاہیے؟

نظری باتوں سے کام نہیں چلیگا، اب ذرا عملی پہلو پر بھی نگاہ ڈالیئے۔
سنیئے اور ہم سب پر رحم کھاکر غور سے سُنیئے۔
ایک طرف حکومت ہے، دوسری طرف ہندو۔ دیکھنا یہ ہے کہ اخوت و محبت کا امکان کس سے ہے؟ خیال رکھئے گا کہ میں امکان پر زور دے رہا ہوں۔
کیا کوئی حکومت، محکومیت سے مصالحت کرکے اپنی ہستی کو موت کے منہ سے بھی بچا سکتی ہے؟
اور کیا کوئی حکومت، محکومیت سے رشتۂ اخوت قائم کرکے زندہ بھی رہ سکتی ہے؟ تو کیا آپ حکومت کو اس قدر احمق سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کی محبت میں خودکشی کرلے گی، اپنا گلا خود اپنے ہاتھوں سے کاٹ ڈالے گی؟
اور جب حکومت سے مصالحت و اخوت کا کوئی امکان ہی نہیں ہے تو آیئے ہندو کی طرف ــــ
ہندو اس کرۂ عرض پر سب سے بُرا سہی، مگر وہ آپ ہی کے ساتھ ایک ہی کشتی پر سوار ہے مانا کہ اپنے غلط عقائد و عادات کی بنا پر وہ آج آپ کی دشمنی پر کمر باندھے ہوئے ہے، مگر کل عقل آتے ہی، وہ خود اپنے زندہ رہنے کی خاطر اس پر مجبور ہو جائے گا کہ آپ سے رشتۂ اخوت قائم کرکے اور آپ کے دوش بدوش جنگ آزادی میں آپ کا ہاتھ بٹانے لگے۔
آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ یعنی ایک طرف تو صلح و آشتی کا "امکان" ہی نہیں ہے، اور دوسری طرف "امکان" موجود ہے۔
ان حالات میں عقلمند کیا کریگا "ناممکن" کا تعاقب کریگا۔ یا ممکن کا؟ "عدم امکان" کی جانب مائل ہوگا۔ یا "امکان" کی طرف؟

کبھی اس پر بھی للّٰلہ غور کیا کیجیے کہ کیا طوفان زدہ کشتی پر بیٹھ کر لڑنے والے کبھی ساحل تک پہونچ سکتے ہیں؟

صغیر۔ آپ بہت پیچیدہ باتیں کر رہے ہیں اور منطقی استدلال سے مجھے خاموش کر دینا چاہتے ہیں، اچھا اب تو میں جاتا ہوں، کل انشاء اللہ ملوں گا۔

کبیر۔ نہیں بھائی صاحب، ذرا اور ٹھہر جائیے۔ آپ ہندو مُسلم اتحّاد کے بارے میں اکثر مجھے چھیڑا کرتے ہیں، میں چاہتا ہوں آج حجت تمام کر دوں، صرف ایک بات اور سن لیجئے۔ ٹکڑے ٹکڑے بات کرنے میں بات کا مزا بھی جاتا ہے اور مفہوم بھی مُبہم ہو کر رہ جاتا ہے، کیا آپ مسلمان ہیں؟

صغیر۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر، الحمد للّٰہ

کبیر۔ آپ کو اِسلام، اور اِسلامی ممالک سے محبت ہے؟

صغیر۔ یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے، اگر میرا خان اور میری ہڈیاں کام آئیں تو بھی میں دریغ نہیں کر سکتا۔ شہادت کا مرتبہ۔ اللہ اکبر۔

کبیر۔ اگر آپ سیاسیات حاضرہ و گذشتہ سے واقف نہیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اِسلامی ممالک کی تسخیر کے لئے کتنے بڑے بڑے جال بچھائے گئے ہیں اور اسلام کو دنیا سے فنا کر دینے کی کیا کیا کوششیں کی جا رہی ہیں۔

صغیر۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) جی ہاں مجھے تھوڑا بہت علم ہے۔

کبیر۔ شاید آپ کو یہ معلوم نہیں اس لئے میں بتا دیتا ہوں کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو جائیگا، آپ کا اسلام، اور آپ کے اسلامی ممالک ہمیشہ خطرے ہی میں رہیں گے۔

صغیر۔ کیا واقعی ایسا ہے؟

کبیر۔ جی ہاں ایسا ہی ہے، میں واقعات اور اعداد و شمار سے اس کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ،

صاحب ایک بار نہیں لاکھ بار مان لیا کہ ہندو بُرا ہے، بُرا ہے، بُرا ہے لیکن کیا کیا جائے۔ اخوت کا امکان ہے تو اس سے ـــــ اور جب یہ حالت ہے تو پھر اُس بُرے کو اچھا، اُس مریض کو تندرست اور اُس دشمن کو دوست بنانے کی فکر کیوں نہ کی جائے؟ ممکن ہے یہ بُرا اچھا ہو جائے اور کل ہمارے دوش بدوش سعی کر کے آزاد کرانے میں ہمارے دست و بازو بن جائے

صغیر۔ کیوں صاحب آپ ادھر کیوں نہیں آتے کہ تمام مسلمان منتظم ہو کر ہندو کا مقابلہ کریں

کبیر ـــ اس کے دونوں رُخ خطرناک ہیں۔

صغیر۔ خطرناک؟

کبیر ـــ جی ہاں خطرناک، اور سخت خطرناک، آپ نے یہ دوہا سُنا ہے۔

آؤ سکھی چوسر کھیلیں اپنے پی کے سنگ
جیتی تو پی ملیں گے، ہاری تو پی کے سنگ

جس طرح "پی" کے ساتھ چوسر کھیلنے میں جیتنے اور ہارنے، ہر حالت میں نفع ہے، جیتنے پر تو "پی" مل جائیں گے، یعنی "پی" قبضے میں آجائیں گے، اور ہارنے میں "پی" کے ساتھ رہنا ہوگا، یعنی "پی" کا قبضہ ہو جائے گا۔

اسی طرح ہم نے اگر ہندو سے جنگ کی تو ہر حالت میں ہم خسارے ہی میں رہیں گے فرض کیجئے کہ ہم ہندو پر غالب آگئے، تو کیا ہندو پر غالب آجانے سے آپ شاہنشاہِ اورنگ زیب بن جائیں گے، رہیں گے وہی غلام کے غلام، بلکہ ایک ہاتھ ٹوٹ جانے سے ملک اور بھی کمزور ہو جائے گا اور آزادی محض ایک وہم باطل ہو کر رہ جائے گی۔ اور اگر ہندو آپ پر غالب آگئے تو تمام متذکرہ بالا ملکی خرابیوں کے دوش بدوش آپ دُہرے غلام بن کر رہ جائیں گے؟

ہندوستان کی محکومی، اسلام اور اسلامی ممالک کے حق میں زہر اور زہر ہلاہل ہے۔

صغیر۔ تو پھر کیا کیا جائے۔

کبیر۔ اپنے دین و مذہب، اور اپنے ٹکے ٹکے مدینے کی خاطر ہندو سے مصالحت کر لیجئے۔

ایک حدیث میں ہے کہ مومن جب دو مصیبتوں کے درمیان ہو تو اُن میں جو ہلکی مصیبت ہو اُسے اختیار کر لے۔ میں ہندوؤں کو آپ کی طرح ہرگز ہرگز بُرا نہیں سمجھتا مجھے ہندو کی شرافت و عقل پر اعتماد ہے کہ وہ مسلمانوں سے کبھی نہیں بگاڑیگا لیکن چونکہ آپ اُسے بُرا اور بہت بُرا سمجھتے ہیں اِس لئے آپ کے نقطہ نگاہ سے آپ دو مصیبتوں کے درمیان ہیں یعنی :-

(۱) محکومی۔

(۲) اور ہندو۔

اِس لئے آپ کو اِن دونوں میں سے ایک مصیبت سے نجات حاصل کرنا اور ایک سے مصالحت کرنا ہے۔

محکومی کے متعلق میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ یہ آپ کے اسلام کے حق میں زہر ہے، اس لئے بڑی مصیبت ہے، آپ کو اس بڑی مصیبت سے نجات حاصل کرنا چاہیے اب رہی دوسری لیکن چھوٹی مصیبت یعنی ہندو اس سے آپ کو عقل اور حدیث دونوں کی رو سے مصالحت کر لینا چاہیئے۔

جی چاہے، یا نہ چاہے، آپ اسے کڑوی دوا سمجھ کر ہی پی جائیں، اور اگر تندرستی کے آثار نہ پیدا ہونے لگیں تو سرِ بازار میری تشہیر کیجئے گا اور اگر مر گیا تو میری قبر کو کھود کر پھینک دیجئے گا۔

ہمہ دانی

ہماری یہ صدی، "ہمہ دانی" کی صدی ہے کیونکہ ہم اتنے متعدد مسائل اور اس قدر مختلف علوم میں اپنی دستگاہ کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ آخر کار اربابِ نظر کو پتا چل جاتا ہے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں، اور ہماری نظر کس قدر وسیع واقع ہوئی ہے۔

یہ ایک شرمناک حقیقت ہے کہ ہمارے علمی رحجانات جس قدر وسیع ہیں اُسی وسعت کے ساتھ کھوکھلے اور سطحی بھی ہیں۔

ہمیں اس کا تو شوق ضرور ہے کہ ہم ہر صحبت میں، دُنیا کے تمام فطری و عملی مسائل پر روشنی ڈال کر سامعین پر اپنے تبحر کا سکہ بٹھا دیں اور جس طرح حافظ شیراز کا نام:-

"گویند ذکرِ خیرش در خیلِ عشق بازاں"

کے سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ اُسی طرح ہمارا نام بھی "در خیلِ علم بازاں" لیا جائے لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ہم میں یہ ذوق پختہ کیسا، پیدا ہی نہیں ہوا ہے کہ جن مسائل پر ہم گفتگو کرتے ہیں، اُن پر در حقیقت حاوی بھی ہو جائیں۔

بات یہ ہے کہ سیاسی حالات کی ابتری، اور ذہنی ماحول کی تنگی کے باعث ہم نے اب تک یہ فیصلہ ہی نہیں کیا ہے کہ علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا بہتر ہے کہ گرمیٔ محفل، اور نمود و معاش کے واسطے ——— علم کی محض چند ابتدائی منزلیں طے کر کے خود فروشی کرتے پھرنا

مناسب ہے، یا درِ اصل علوم میں کامل دستگاہ پیدا کرنا قرینِ دانشمندی ہے۔

ہماری علمی صحبتیں اکثر و بیشتر مضحکہ انگیز ہوا کرتی ہیں۔ ہمارے مذاکرتِ علمی کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی مسئلہ چھڑتا ہے تو مقرر کی تقریر کو تمام و کمال سننے کے عوض، ہم میں سے ہر شخص اس بات کے لئے بیتاب نظر آتا ہے کہ جلد سے جلد اُسے اپنی رائے کے اظہار کا موقع مل جائے، اور جب مقرر کی تقریر کسی قدر طویل ہونے لگتی ہے تو "معاف فرمائیے گا،" اور "قطعِ سخن تو ہوتا ہے،" کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگتی ہیں۔

واضح رہے کہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہو سکتا جس پر ہم اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہوں۔ ہم میں سے اکثر، اربابِ علم کا ماخذ ہوتی ہیں، گھبرائے ہوئے ایڈیٹروں کی رائیں، اور بھٹکے ہوئے مقالہ نگاروں کی تنقیدیں، یا زیادہ سے زیادہ "انسائیکلوپیڈیا" کی جلدیں، ہم اُن تمام رائیوں اور تمام تنقیدوں کو، جو ہمیں مہنگے یا سستے رسالوں اور اخباروں سے گھڑی گھڑائی، اور ڈھلی ڈھلائی مل جاتی ہیں، چپ چاپ تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جب کسی علمی صحبت میں علم فروشی کا موقع ہات آجاتا ہے تو ہم اُن تمام بنی بنائی مستعار رائیوں اور تنقیدوں کو اپنے "ذاتی علمی تصورات اور حکیمانہ نظریات،" کی شکل میں میزوں پر گھونسے مار مار کر اس دلولے اور طمطراق کے ساتھ پیش کرنے لگتے ہیں۔ گویا مادرِ فضیلت کا خلفِ اکبر اپنی تخت نشینی کا اعلان کر رہا ہے۔

ہماری علمی صحبتوں میں اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ اصلی موضوع سے رفتہ رفتہ اِس قدر ہٹتے چلے جاتے ہیں کہ آخری فقرہ ختم کر کے یہ پوچھنا پڑتا ہے کہ ہم کس مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے ایک صحبت میں تاریخ کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا۔ لیکن دو گھنٹے کی طویل مکالمت میں نفسِ تاریخ، یا مغزِ تاریخ یا مقصدِ تاریخ پر کسی نے ایک فقرہ بھی زبان سے نہیں نکالا، البتہ اس قسم کے اُمور پر بہت کھُل کر باتیں ہوتی رہیں کہ ہمایوں کس دن پیدا ہوا تھا، بیرم خاں

دراز قد تھا کہ پستہ قامت، ہیمو بقال ڈاڑھی رکھتا تھا کہ منڈاتا تھا، اور سکندرِ اعظم کی ماں کا نام اس کی دادی کو پسند تھا کہ نہیں؟

افسوس کہ ہماری علمیت،، میں عُمق کا کوئی عنصر نہیں پایا جاتا، اس لئے ہم اپنے علم کو صرف ایک ,,کھلونا علم،، تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ہم دوسروں کے خیالات و ملفوظات کے اُڑا لینے میں تو بہت شاطر ہیں، مگر یہ نہیں جانتے کہ اُنھیں تفکر کی ترازو میں کیوں کر تولا، اور تدبّر کی بھٹّی میں کیونکر تپایا جا سکتا ہے۔

اربابِ نظر اِس حقیقت کو متعدد بار دُہرا چکے ہیں کہ صرف "پڑھ لینے،، سے کوئی شخص تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتا، اور جب تک کہ ,,پڑھا ہوا،، انسان کافی طور سے ,,گڑھا ہوا،، نہ بن جائے اور اپنے ,,پڑھے ہوئے،، کو ہضم کر کے جزوِ بدن نہ بنا لے، اُس کا مرتبہ ایک ,,خواندہ جاہل،، کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

یعنی علم جس وقت تک کہ صرف ,,معلوم،، کی حد تک ہے۔ اُسے کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا البتہ جب وہ"معلوم،، کی منزل سے گزر کر محسوس کے دائرے میں آ جاتا ہے تو اُس وقت وہ دنیا کی سب سے بڑی عزت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

ہم پر ہمہ دانی،، کا بھوت اِس قدر سوار ہے کہ اکثر و بیشتر افراد بغیر شرم محسوس کئے اِس بیسویں صدی میں اِس کا ڈھنڈورا پیٹتے نظر آتے ہیں کہ سیاسیات، دینیات، ادبیات، نفسیات، معاشیات، طبیعیات، مابعد طبعیات، اور خدا جانے کتنے دیگر ,,دآت،، سے لے کر شطرنج، چوسر، علم الید، موسیقی، عُروض، پتنگ بازی، رَمل، جفر، کُشتی اور گھوڑوں کی جرّاحی تک میں اُنھیں ایسی دستگاہِ کامل حاصل ہے کہ ملک میں اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اور اُس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک عجیب تماشہ ہے کہ ایسے اشتہاری علماء اپنی

پشت پر معتقدین کی ایسی بڑی بڑی جماعتیں رکھتے ہیں جو اُنھیں "جامع العلوم" کے نام سے پکارتی اور اُن کے ہر دعوے پر سرِ تسلیم خم کر دیتی ہیں۔

حیرت، بالائے حیرت ہے کہ اب تک ہم میں موٹی موٹی باتوں تک کے سمجھنے کا سلیقہ نہیں پیدا ہوا ہے —— معمولی سی بات ہے لیکن کسی کی اس پر نظر ہی نہیں پڑتی، کہ قدرت نے انسان کو اس قدر مختصر زندگی دی ہے، اور اس افسوسناک اختصار کے باوصف، اُس کی زندگی کو اتنی مصروفیتوں، غفلتوں، ہیجانوں، اور بیچارگیوں کا صید مستقبل بنا رکھا ہے کہ دنیا کے تمام علوم تو بڑی چیز ہیں، اُس غریب کو صرف ایک علم میں بھی کمال حاصل کرنے کا وقت نہیں ملتا۔

کتنی پیش پا افتادہ بات ہے کہ اس عظیم الشان کاروبارِ حیات میں، ہمیں صرف ساٹھ برس جینے کا حق دیا گیا ہے —— اگر طفلی سے لے کر پیری، یا پیدائش سے لیکر موت تک انسانی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ صرف ان لوگوں کو جو تمام حوادث سے محفوظ رہتے ہوئے عمرِ طبعی تک پہونچتے ہیں، کسی خاص علم و فن میں مہارت حاصل کرنے کا جو وقت ملتا ہے وہ کسی طرح آٹھ دس سے زیادہ نہیں ہوتا۔

یہ آٹھ دس برس بھی فیاضی کے ساتھ حساب لگا کر بتائے گئے ہیں۔ ورنہ مدّت کار تو صرف پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن اگر ان آٹھ دس برسوں کو ہی تسلیم کر لیا جائے، تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم اس قلیل مدّت میں سیکھ ہی کیا سکتے ہیں، اور ان حالات میں کسی کا "ہر فن مولا" کا دعویٰ کرنا ایک مضحکہ خیز بات کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔

کسی کا قول ہے کہ جب ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ جینا شروع کریں تو اسی وقت ہمیں موت آجاتی ہے۔

ہاں اتنا ضرور ہو سکتا ہے کہ ابتدائے شعور سے لیکر پیری تک اگر کوئی شخص "یک در گیر و محکم گیر" پر عمل پیرا ہو کر کسی ایک ہی علم و فن کی دھن میں لگا رہے، اور اُس کے سوا کسی دوسری چیز کو ہاتھ بھی نہ لگائے اور اپنے فن کی وابستگی میں اُس کے دل پر

"از من بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس"

کی سی محویت طاری ہو جائے، تو زندگی کے آخری ایام میں بیشک اُسے اپنے فن کے اندر ایک ایسا درجہ حاصل ہو سکتا ہے، جسے کمال تو نہیں البتہ مماثلِ کمال ضرور کہا جا سکتا ہے۔

"حاصل ہو سکتا ہے" میں نے جان بوجھ کر لکھا ہے۔ کیونکہ اِن تمام شرائط کے پورا ہو جانے کے بعد بھی اس کی کوئی ضمانت نہیں کی جا سکتی کہ ایسے شخص کو ہمیشہ کامیابی ہی ہوگی — بہت ممکن ہے کہ وہ اِن تمام مراحل کے بعد بھی حصُولِ مقصد میں ناکام رہ جائے۔ جس کی متعدد نظیریں تاریخ میں موجود ہیں۔

لیکن ان باتوں پر غور کرنے والے کتنے ہیں، یہاں تو ہمہ دانی کا ہنگامہ مچا ہوا ہے کوئی اپنی جرمنی کی "ڈاکٹری" پر اکڑ رہا ہے تو کوئی اپنی دیوبندی "دستار" پر اترا رہا ہے، اور کوئی ماہر السنہ ہونے کے غرور میں زمین پر پاؤں نہیں رکھتا۔ لیکن اگر ان سب حضرات کا تجزیہ کیا جائے تو مشکل سے دو فیصدی تو آبِ علم کے اندر کم و بیش کمر کمر تک ملیں گے، اور باقی اٹھانوے فیصدی گھٹنوں گھٹنوں بھی نہیں بلکہ گٹوں گٹوں سے زیادہ نہ مل سکیں گے۔

ماہر السنہ کو علمی حلقوں میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے، میں اُس کے شرف کا منکر نہیں کیونکہ مختلف زبانیں جاننے کے باعث وہ متعدد اقوام کے افکار و خیالات سے بہرہ مند ہو سکتا ہے اور ممالکِ غیر کے سفر میں ہم اُسے ترجمان کی حیثیت سے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

لیکن حقائق و معارف کے دائرے میں صرف ماہر السنہ ہونا کوئی قابلِ منزلت مقام

نہیں سمجھا جا سکتا۔

فرض کیجئے ایک شیر سے ملتا جلتا جانور ہے جسے ہم "بلّی" کہتے ہیں، اس باب میں "یک زبان" افراد پر اس "ہفت زبان" کو یہ فضیلت ضرور حاصل ہے کہ وہ بلّی کے سات ناموں سے واقف ہے لیکن بلّی کے سات ناموں سے واقف ہونے کے باعث کیا وہ اس حقیقت تک بھی پہونچ گیا ہے کہ بلّی دراصل ہے کیا؟

لیکن کیا کسی شے کے متعدد ناموں سے آگاہ ہو کر کوئی شخص اُس شے کی معرفت بھی حاصل کر لیتا ہے؟

اگر ایسا نہیں ہے تو ماہر السنہ صرف اپنے ذخیرۂ الفاظ پر تو جس قدر چاہے اترا لے لیکن حقائق سنجی کے کوچے میں اس کی کوئی پرسِتش نہیں ہو سکتی۔

اگر کوئی شخص تمام اشیاء کے اسماء جانتا ہے لیکن حقیقت کسی کی نہیں جانتا، تو وہ اُس شخص کے سامنے نہایت پست درجہ رکھتا ہے جو تمام اشیاء کے اسماء تو نہیں جانتا، لیکن چند اشیاء کی حقیقت جان چکا ہے۔

ہمارے اظہارِ ہمہ دانی کے مرض کے متعدد اسباب ہیں، جن میں سے (۲) زیادہ قوی معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) اوّل تو یونی ورسٹیوں کی قابلِ ماتم حد تک ناقص تعلیم و تربیت

(۲) دوسرے محکومی۔

شاید کہا جائے کہ "ہمہ دانی" کے مرض کو محکومی سے کیا علاقہ ہو سکتا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ چند لفظوں میں اس کی شرح کر دی جائے۔

بات یہ ہے کہ محکوم قوم ہر نوع کے حقیقی شرف و مجد سے کچھ تو خود محروم ہو جاتی ہے اور

محروم کردی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محکوم قوم کا ہر فرد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ بے عزت و حقیر ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ عزت خواہی انسان کی فطرت میں داخل ہے، یہ وہ خواہش ہے جو اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کہ اس کی کرۂ ارضی پر نوع انسانی کا وجود قائم ہے۔ اس لئے محکوم افراد کو ایک طرف تو اپنی حقارت کا احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف اُن کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی عزت کی جائے۔

چنانچہ اس کشمکش میں پھنس کر وہ ہاتھ پاؤں ہلانا شروع کر دیتے ہیں اور چونکہ انھیں یہ یقین ہوتا ہے کہ محکومی میں وہ حقیقی عزت تو مل نہیں سکتی جس کے متعلق حالی مرحوم ؎

دل جسے محسوس کرتا تھا وہ عزت کیا ہوئی

کہہ گئے ہیں۔ اس لئے وہ ہر اس نمائشی اور جھوٹی عزت کی طرف دوڑنے لگتے ہیں جو اُنھیں قابل حصول معلوم ہوتی ہے۔

اس نمائشی عزت کی بہت سی راہیں ہیں۔ کوئی دولت جمع کرنا شروع کر دیتا ہے کوئی لیڈری کا پیشہ اختیار کرتا ہے، کوئی پیری مریدی کرنے لگتا ہے، کوئی غداری اور جاسوسی پر کمر باندھ لیتا ہے، کوئی عہدوں اور خطابوں کے پیچھے دوڑتا نظر آتا ہے اور جن سے یہ کچھ نہیں بن پڑتا وہ اپنے ہاتھوں "پُر ہمہ دانی" کے بوجھ لٹکائے ممبروں پر خطبے دیتے نظر آتے ہیں۔

ان متذکرہ بالا شکلوں میں سے ہر شکل مخلوق سے ایک مطالبہ ہے کہ اگر تو میری حقیقی طور سے عزت نہیں کرتی، تو کمبخت اس جہت اور اس صورت سے تو میری عزت کر کہ میں یہ ہوں اور میں وہ ہوں۔

جس قدر بھی غور کیجیے اس مرض کے دفع کرنے کی یہی صورت نظر آتی ہے کہ پہلے تو یونی ورسٹیوں کی تعلیم و تربیت کو تندرست کیا جائے تاکہ ہمارے ذہنی ماحول میں روشنی اور ہوا پہونچ سکے، دوسرے سیاسی ماحول کو جلد تر بدلنے کی ہر ممکن سعی کی جائے تاکہ ہم خود اپنی زندگی کا ضابطہ مرتب کرنے کے قابل ہو جائیں۔

جس وقت یہ دونوں صورتیں پیدا کرلی جائیں گی اُس وقت ہندوستان پر یہ راز افشا ہو جائے گا کہ "ناقص ہزار من" سے "کامل یک فن" کا مرتبہ زیادہ بلند اور زیادہ ارفع ہوتا ہے اور اس وقت یہ حقیقت بھی کھل جائے گی کہ اگر قلم کی نوک سے پیشانیٔ روزگار پر کوئی لافانی نقش بنانا ہے تو یہ معرکۂ عظیم وہی اور صرف وہی ادیب اعظم سر کر سکتا ہے جو صبحِ زندگی کی پہلی کرن کے سونے سے لیکر شامِ زندگی کی آخری کرن کے سرمے تک ایک ہی صنفِ علم کیطرف رخ کئے برابر چلتا رہا ہو جسے راستے کے درختوں کی خنک چھاؤں نے دم لینے پر ایک بار بھی مجبور نہ کیا ہو، اور جسے دوسرے شاخ در شاخ راستوں کے نظر فریب موڑ موڑ مستقیم سے کبھی ایک قدم بھی نہ ہٹا سکے ہوں۔

زندہ ہزار شیوہ، اطاعتِ حق گراں نبود
لیک صنم بہ سجدہ در، سجدۂ مُشترک نخواست

غالب

وہ مظالم جو روز ہوتے ہیں

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہمارا شکار کا ذوق، صدہا بے گناہ جانوروں، اور ہزاروں معصوم طائروں کو گولی سے نہ اڑا دیتا ہو۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہمارے معدے کی خاطر بکرے، مینڈھے، تیتر اور مرغ وغیرہ نہ حلال کئے جاتے ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہمارے پاؤں کے نیچے سینکڑوں کیڑے مکوڑے کچل کر نہ مر جاتے ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ درندے، اور سانپ، جانوروں اور انسانوں کو ہلاک نہ کرتے ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ریلیں، اور لاریاں جانداروں کو نہ پیس ڈالتی ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ سواری اور بار برداری و کاشتکاری کے جانور اپنے مالکوں کی بے رحمیوں کے ہاتھوں کام کرتے کرتے دفعتہً اُسی جگہ گر کر نہ مر جاتے ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ مکڑیاں، مکھیوں کو چھپکلیاں، کیڑوں اور پتنگوں کو، اور بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نہ نگل جاتی ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں کہ غریبوں کو امراء نہ روند ڈالتے ہوں۔ اور کوئی دن ایسا نہیں

جاتا کہ قوی انسان کمزور انسان کو قتل نہ کر ڈالتا ہو۔

یہ وہ مظالم ہیں جو اس آسمان کے نیچے ازل کے روز سے برابر ہو رہے ہیں اور آج بھی بلاناغہ روزانہ ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔

اِن میں سے دو ایک مظالم تو سوسائٹی، مذہب اور قانون کی نگاہ میں قابلِ سزا ہیں، اور باقی کثیر مظالم کو خود سوسائٹی، مذہب اور قانون نے سندِ جواز دے رکھی ہے۔

مکھی کو مکڑی کے جال میں پھڑپھڑاتے اور بھنبھناتے اگر ہم دیکھ بھی لیتے ہیں تو بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے ــــ سڑکوں پر قصاب، بکروں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے کان پکڑے گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے، اور وہ ہر قدم پر چیختے چلاتے جاتے ہیں، مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی معصوم چڑیاں چہچہوں میں مصروف ہوتی ہیں کہ بندوق کا دھماکا ہوتا ہے اور وہ زمین پر گر کر پھڑپھڑانے لگتی ہیں، مگر کوئی ہمدردی نہیں کرتا۔

آخر اِس ہر روز ہلاک ہونے والی مخلوق کا خالق کون ہے؟ اور کیا وہ اس قدر کمزور ہے کہ اپنی مخلوق کو بچا نہیں سکتا؟

یا اس دنیا کے دو خالق ہیں ایک ناطاقتوں کا، اور ایک طاقتوروں کا؟

اگر ایسا ہے تو کیا دونوں مساوی القوت ہیں؟ یا یہ ہے کہ ناطاقتوں کا خالق ناطاقت اور طاقتوروں کا خالق طاقتور ہے؟ یا یہ کہ ناطاقتوں اور طاقتوروں، دونوں کا خالق ایک ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا اِس کا کوئی جواب دیا جاسکتا ہے کہ آخر وہ خالق اپنی ناطاقت مخلوق کو، طاقتور مخلوق سے کیوں ہلاک کرا ڈالتا ہے

کیا دراصل وہ یہ چاہتا ہے کہ ناطاقت مخلوق باقی نہ رہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اُس نے ناطاقت مخلوق کو خلق ہی کیوں فرمایا؟

یا یہ معاملہ ہے کہ اُس نے ناطاقت مخلوق کو صرف اسی لئے خلق فرمایا ہے کہ وہ طاقتور مخلوق کی غذا بن کر اُسے اور زیادہ طاقتور بناتی رہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ ناطاقت مخلوق کو جس وقت ہلاک کیا جاتا ہے تو اس وقت اُسے لطف آتا ہے، یا تکلیف پہونچتی ہے؟

ناطاقت مخلوق کے چیخنے تڑپنے اور زبان باہر نکال دینے سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے ہلاکت کے وقت سخت اذیت ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ اذیت اُسے کس قصور اور کس خطا پر دی جاتی ہے؟

کیا محض اس تنہا بنا پر کہ وہ کمزور ہے؟ اور اگر بنائے اذیت یہی ہے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا ناطاقت مخلوق اپنی کمزوری کی خود ذمہ دار ہے۔ یا وہ پیدا ہی کمزور کی گئی ہے؟

ظاہر ہے کہ کمزور مخلوق پر کمزور ہونے کی ذمہ داری کسی طور سے بھی ثابت نہیں ہو سکتی تو کیا قدرت کی بخشی ہوئی کمزوری کی سزا اُس کی کمزور مخلوق کو ملنا چاہیئے یعنی قصور کسی کا ہو، اور سزا کسے ملے، یہی بات ہے نا؟

پس، ان حالات میں کس کی مجال ہے کہ اس عالم کون و فساد میں کوئی انصاف کا نام زبان پر لا سکے۔

پس جو کچھ ہو رہا ہے، وہی انصاف ہے، اور جو کچھ اس سے بھی زیادہ ہوگا وہ اس سے بھی بڑا انصاف ہوگا۔

یہ چھوٹی موٹی روزمرہ کی باتیں ہیں، جو سیدھے سادھے انداز میں سرسری طور پر لکھدی گئی ہیں، مگر ارباب بصیرت کے لئے ان میں غور کرنے کی اتنی زبردست گنجائش ہے کہ اگر چشم اُنھیں کے ذریعے سے دُنیا کے بڑے بڑے نظریات و کلیات کو یکسر بدل دیا جا سکتا ہے۔

کاش کوئی غور کرے! کاش کوئی صاف اور غیر آلودہ عقل کے ساتھ غور کرے

ایک رِند کا اعلانِ جنگ

میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے ــــــــ اور صبح پیری کے طلوع ہوتے میں بہت دیر باقی نہیں ــــ یہ ایک ایسا سانحہ ہے کہ روتے روتے آنکھیں پھوٹ بھی جائیں تو کم ہے۔

اڑتیس، انتالیس سال کی عمر، اور قربِ قیامت، یعنی پیری کا احساس ــــــ بلاشبہ یہ تعجب کا محل، اور ماتم کا مقام ــــــــ لیکن کیا کیا جائے، غلام قوموں کی جوانی پائدار نہیں ہوا کرتی ــــــ جوانی غلامی کی معیت سے کتنی شرماتی ہے!

آزاد قوموں کی زندگی میں تین فصلیں ہوتی ہیں، لڑکپن ــــــ جوانی ــــــ بڑھاپا، لیکن غلام قوم کی زندگی میں صرف دو ہی موسم آتے ہیں۔

لڑکپن ــــــــــــــــ اور بڑھاپا

مرحوم حضرتِ عزیز لکھنوی نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

اِس صحیفے سے کسی نے اک ورق کم کر دیا

اگر غلام قوم میں کسی پر اتفاق سے جوانی آ بھی جاتی ہے تو بن کھلے غنچے کی طرح قبل از وقت ہی مرجھا کر رہ جاتی ہے ــــــــــــــ

اور اگر کوئی بدقسمتی سے غلام ہوتے ہوئے حسّاس بھی واقع ہوا ہے تو اس کے بالوں

کی سیاہی اور شگفتگی کا خدا ہی حافظ ہے ——— اُس کے چہرے اور اُس کی عمر میں دوڑ ہوتی ہے ——— عمر ہانپ کر پیچھے رہ جاتی ہے اور یہ اُس کا چہرہ، احساس گزیدہ چہرہ ہی ہوتا ہے جو ہمیشہ عمر سے آگے نکل جایا کرتا ہے۔

کیا عمر کے ساتھ ساتھ چلتا چہرہ
کیوں شیب کے سانچے میں نہ ڈھلتا چہرہ؟

احساس پہ چہرہ، وقت پر عمر سوار
کیوں عمر سے آگے نہ نکلتا چہرہ؟

پیری کے متعلق بلبلِ شیراز نے بھی کیا خوب کہا ہے:-

من پیرِ ماہ و سال نیم، یارِ بے وفا

بر من چو عمر می گزرد، پیر ازاں شدم

ہاں تو میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے ——— میں پیری کا منحوس چہرہ دیکھنے پر راضی نہیں

کوئی صاحبِ غیرت، پیری کے استقبال پر طیار نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ غور کرتا ہے کہ

جب اَوج پر عمر کا ستارا ہوگا
اس سود میں سر بسر خسارا ہوگا

حیراں ہوں کہ داغِ شیب و ننگِ پیری
کیونکر مری غیرت کو گوارا ہوگا

اگر صاحبِ غیرت ہونے کے ساتھ ساتھ کسی کا مزاج شاعرانہ بھی ہے تو اُس کی رنگین شریعت میں تو پیری اُسی قدر مبغوض و مکروہ ٹھہرے گی، جیسے اسلام میں طلاق اور ہندوستان میں حُبِّ وطن ——— وہ تو گڑگڑا گڑگڑا کر یہی دعا مانگے گا کہ:-

مرضی ہو تو سُولی پہ چڑھانا یا رب
سُو بار جہنم میں تپانا یا رب

معشوق کہیں "آپ ہمارے ہیں بزرگ"
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

اور اگر غیر تمندی و شعریت کے دوش بدوش کوئی حکیمانہ مزاج بھی رکھتا ہے تو وہ صرف جذبات ہی کی بنا پر نہیں، اپنے مشاہدۂ تفکر اور بصیرت کی رُو سے بھی زندگی کو ایک ظالمانہ مسخرگی اور پیری کو ایک بے پناہ قہر سمجھنے پر مجبور ہوگا۔ اور اگر کوئی اُسے جینے کی دُعا دیگا تو وہ بگڑ کر کہے گا کہ:

ناواقفِ ابتدا نہیں ہوں شاید
بیگانۂ انتہا نہیں ہوں شاید

ہو طولِ حیات کی تمنّا مجھ کو!
اتنا تو میں بے حیا نہیں ہوں شاید

ہاں تو میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے اور صبح پیری کے طُلوع ہونے میں بہت دیر باقی نہیں ——— میں پیری پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اُس کا جھریوں سے سمٹا ہوا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا ——— پیری کے تصور سے کافور و کفن کی بُو آتی ہے ——— لیکن مغضوبِ قدرت، اور معتوبِ مشیّت حیوان کے ساتھ، جو خود کو اشرف المخلوقات کہہ کر اپنی ہی خوشامد کیا کرتا ہے، ازل کے دن سے یہی سفاکانہ کھیل کھیلا جا رہا ہے کہ وہ جن چیزوں کی طرف دوڑتا ہے۔ وہ اُس سے بھاگتی ہیں ——— اور جن چیزوں سے وہ بھاگتا ہے وہ اُس کے پیچھے دوڑتی ہیں ———

اگر خدانخواستہ اور نصیبِ اعدا، یہی پُرانا اور منجھا ہوا کھیل مجھ سے بھی کھیلا گیا، اور پیری میرے علی الرغم، مجھ پر مُسلط کر دی گئی، تو یہ دنیا یہ تماشا بھی دیکھ لے گی کہ میں اُس کا خم ٹھونک کر مقابلہ کروں گا ——— میں اُن لوگوں میں سے ثابت نہ ہوں گا جو پیری کی کھنیسیں نکلنے لگتے، اور سپر انداختہ ہو جاتے ہیں ———

ہاں میں پیری کو اپنا حاکم بنا کر مشیّت کا کلیجہ ٹھنڈا نہ کروں گا۔

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بُنیادش بر اندازیم

میں نے پیری سے جنگ کرنے کے لئے کافی سامانِ حرب جمع کر لیا ہے ۔ میری جوانی نے سفرِ پیری کے واسطے اِتنا زادِ راہ اکٹھا کر لیا ہے کہ اِس راستے کی بھوک پیاس کا میں بہ آسانی مقابلہ کر سکوں گا ـــــــ اور شیب کو نیچا دکھانے کی خاطر میرے شباب نے اپنے قلعے میں اِس قدر رسد جمع کر رکھی ہے کہ وہ دشمن کے محاصرے کا تمام عُمر مقابلہ کر سکتی ہے ۔

آپ سمجھے وہ رسد اور وہ زادِ راہ کیا ہے ؟ وہ زادِ راہ اور وہ رسد میرا یہ مُحکم اور فخر آمیز احساسِ مسرت ہے کہ میں نے اپنی جوانی کو استعمال اور بقدرِ طاقتِ بشری جی کھول کر استعمال کیا ہے ۔

میں نے اپنی جوانی کو جنگل کے پھول کی طرح ضائع نہیں ہونے دیا ہے ، میں نے اُس کی ایک ایک پنکھڑی کا رس چوسا ہے ـــــــ میں نے جوانی کے ایک ایک لمحے کو نچوڑا ہے اور میری کوئی ایک اُمنگ بھی ایسی نہیں ہے ، جسے روزِ ابر میں جھومنے ، اور شبِ ماہ میں انگڑانے کا موقع نہ دیا گیا ہو ۔

میں ۔ تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکست ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

پر ہمیشہ عامل رہا ہوں ـــــــ

میں ایک لمحے کے لئے بھی ـــــــ

بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

کا قائل نہیں رہا ــــــ کبھی کبھی تنہا چھوڑنا، مذہبِ زندی میں کفر ہے ــــــ میں نے تو دل کو ہمیشہ تنہا ہی رکھا ہے۔

خلوتِ خاص عشق را بنگر
کہ بروں کردہ اند نیز مرا

سوسائٹی کی وہشت زدگی کے خلف الرشید یعنی "جوانِ صالح" اور مادرِ حور و قصور کے فرزندِ اکبر یعنی "شیخ وقت" کی طرح تو میں نے جوانی کو ضائع نہیں کیا ہے کہ پیری سے ڈر جاؤں "جوان صالح" کی بزدلی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ:-

یہ ہے توہینِ جوانی کہ خدا یاد رہے

اور "شیخ وقت" کی تاجرانہ عبادت کو آگاہ ہونا چاہیئے کہ:-

بن بن کے سحر جلوہ نما ہوتی ہیں
کب نور سے ظلمتیں جدا ہوتی ہیں
شیطان کے ایما سے ادا ہوتی ہیں
اس کی بھی خبر ہے کہ نمازیں کتنی

اور اسی کے ساتھ ساتھ ان دونوں سے یہ بھی کہہ دیا جائے کہ:-

اُس کا جمال چھوڑ کر اُس سے بہشت مانگنا
تیری نظر میں ہو ہنر، میرے لئے تو ننگ ہے

"جوان صالح" ممکن ہے کبھی سنبھل بھی جائے لیکن مجھے تو "شیخِ وقت" پر رونا آتا ہے۔

بیچارے کی اک شب نہ سہانی گزری
کیا شیخ کی تلخ زندگانی گزری
جنت کی دعاؤں میں جوانی گزری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا بیتا

آپ سمجھے جنت کی دعاؤں کے پیچھے کونسا جذبہ کام کیا کرتا ہے؟

یہ طیّاری ہے، یا تمنّا جنّت میں اُن تمام افعال کے کرنے کی جو رِند اِس عالمِ خاکی میں کیا کرتے ہیں۔

"جنّت جسے کہتے ہیں اُبھرنا ہے وہاں
حُوریں ہیں جہاں، مجھ کو سنورنا ہے وہاں"
"کہتا ہے یہ شیخ تم گُنہ کرلو یہاں
اور مجھ کو یہ ہر گُناہ کرنا ہے وہاں"

ہاں تو میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے، اور صبح پیری کے طُلوع ہونے میں بہت دیر باقی نہیں ہے۔ آنے دو پیری کو ——— میں اُس پر قہقہے ماروں گا، میں اُس کا ایسا مذاق اُڑاؤں گا کہ وہ رو پڑے گی۔

بحمد اللہ کہ آبِ وضو کی دَلدَل، اور ہوائے ریش کی رُطوبت میں تو میں نے جوانی گزاری نہیں ہے ——— ہاں میں کہہ سکتا ہوں، اور فخر سے کہہ سکتا ہوں۔

کِس رات کو کی نہ بادہ خواری ہم نے
کب کاکُلِ عشرت نہ سنواری ہم نے
اب تک تو یہ رات، جس کو کہتے ہیں شباب
زلفوں ہی کے سائے میں گزاری ہم نے

ہاں میں رند ہوں ——— رند ——— لااُبالی ——— سیہ مست رِند ——— موت و حیات سے بیگانہ ——— آغاز و انجام سے ناواقف ——— سُود و زیاں سے بالا ——— دُنیا و عقبیٰ کو ٹھکرانے والا۔ نقد سے بہرہ یاب، اور نسیہ سے رُوگرداں ——— سُنو میری تعلیم۔

مفلوج ہر اصلاحِ ایماں کر دے
فردوس کو رہنِ طاقِ نسیاں کر دے
ساقی ہے، مُغنّی ہے، چمن ہے، مے ہے
اِس نقد پہ سَو اُدھار قرباں کر دے

میں اعلان کروں گا اور ضرور اعلان کروں گا، اور:-

گرچہ بر واعظِ شہر ایں سُخن آساں نہ شود

ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کروں گا کہ :-

سرم خوش است وببانگِ بُلند می گویم
کہ من نسیم حیات از پیالہ می جُویم

ہاں میں رِند ہوں — اور رِندی پر فخر کرنے والوں میں سے ہوں — اور میرا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ میں اپنے کو "گناہگار" نہیں، بلکہ "معصوم" سمجھتا ہوں "گناہگار" ہوں میرے دشمن — "گناہگار" ہو میری بلا۔

فرقِ من وشانِ کجکلاہی ساقی،	رندی میں نہیں ہے کم نگاہی ساقی
واں گُم ہیں اوامر و نواہی ساقی،	اللہ کا بندے سے تعلق ہے جہاں

"گناہگار ہوں گے وہ، جو ہات پیر چُھواتے ہیں۔ اپنی جھوٹی نمازوں کے وزن سے زمین کا پیٹ لچکاتے رہتے ہیں — ڈاڑھیوں کے سائے میں مال حرام کھاتے ہیں — جاہلوں کو دوزخ کی آگ اور نزاع کی تکلیفوں سے دھمکا دھمکا کر روپیہ اینٹھتے ہیں۔ حمقا کی بیویوں سے پاؤں دبواتے اور ع

چوں بخلوت می روند، آں کارِ دیگر می کُنند

پر عمل پیرا ہو کر مذہب اور آئینِ مذہب کو رسوا کرتے رہتے ہیں۔

ہاں میں رِند ہوں، شاہد باز اور شراب خوار رند — جیسا ہوں، دُنیا کو معلوم ہے۔ میری کتابِ حیات، ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، جہاں سے چاہو ورق اُلٹ لو۔ میری کتاب میں کوئی "باب الاسرار" موجود نہیں ہے۔

کیا کوئی خدا کا بندہ ثابت کرسکتا ہے کہ میں نے کبھی کسی کا دِل دُکھایا؟ کسی کا حق غصب کرلیا؟ یتیموں، بوڑھوں اور بیواؤں کی خدمت گزاری سے مُنہ موڑا؟ خدا کی زمین پر فساد پھیلایا

مال وقف ہضم کرلیا؟ قدرت نے جو کچھ دل ودماغ پر نازل فرمایا، اُسے اپنی قوم تک پہنچانے میں میں نے کبھی بُخل کو روا رکھا؟ اپنی ملت کو بیداری و آزادی کی طرف نہیں پکارا؟ اور میں دوستوں کے ساتھ محبت، اور دشمنوں کے ساتھ مدارات کے ساتھ پیش نہیں آیا؟

اگر یہ تمام باتیں صحیح ہیں تو خدارا جواب دو کہ مجھے "گناہگار" کہنے کا اُس وقت تک کون ارتکاب کرسکتا ہے جب تک کہ اُس کے انصاف کی آنکھیں پھوٹ نہ جائیں؟

سوسائٹی کیا ہے؟ رسم ورواج، تعصبات، اور اوہام وروایات کی غلامی کا پھندا، جب تک میں ایک اچھے اور مفید شہری کی صورت سے زندگی بسر کر رہا ہوں، جب تک دوسروں کے حقوق کو مجھ سے جراحت نہیں پہونچتی، اور جب تک کہ میری ذات سے ملکی وقومی مفاد اور امنِ عامّہ کو صدمہ نہیں پہونچتا۔ سوسائٹی میرے معصومانہ اور شاعرانہ اشتغال میں کیوں دخل دیتی ہے؟

جانتا ہوں کہ ہر پھٹے میں پاؤں دینے، اور ہر دفتر میں نام لکھانے والی مدخدائی فوجدار "سوسائٹی"، وہ قہرمانی قوت ہے کہ دُنیا کا ہنوز سب سے بڑا ادارہ، یعنی مذہب بھی اُس سے دبکتا، اور راہ میں اس سے کترا کر نکل جانے ہی میں اپنی خیریت سمجھتا ہے۔

لیکن قوتِ حیات کی قسم، میں اُن "تعصبات" "اوہام" کو جنھیں سوسائٹی نے "جائز" و "ناجائز" کا لقب دے رکھا ہے، کبھی در خورِ اعتنا سمجھ کر اپنی عقل کی توہین کا ارتکاب نہ کروں گا۔

میں سوسائٹی کی تلوار پر بارہا رقص کر چکا ہوں، اور کبھی میرے پاؤں زخمی نہیں ہوئے ہیں۔

ہاں میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے۔ اور صبحِ پیری کے طُلوع ہونے میں زیادہ مُدت باقی نہیں ——— لیکن مجھے پرواہ نہیں

آنکھیں تری جانب نگراں ہیں ساقی، اب ہم سے بھی دُنیا میں کہاں ہیں ساقی
ہم کو نہیں آرزوئے تجدیدِ شباب ہر جام میں سو جوانیاں ہیں ساقی

ہاں تو میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے — کوئی پروا نہیں — میں اس بھیگی ہوئی رات میں پھولوں کا سائبان تعمیر کروں گا۔ شبنم کا شامیانہ نصب کروں گا۔ زہرہ جمالوں کی جھوٹی شرابیں پیوں گا۔ ایسی شرابیں جن کی سُرخی دیکھ کر سجدہ کرنے کو جی چاہے۔

میں نادرہ کنواریوں سے سرگوشیاں کروں گا، عُود و عنبر، اور شراب و گیسو کی خوشبوؤں میں جھولوں گا، دہکتے ہوئے رخساروں میں مُنہ دیکھوں گا، اور مہکتے ہوئے لبوں پر مُہر نشاط ثبت کروں گا۔

میں سازوں کے نغموں، گھنگھروؤں کی جھنکاروں، کوئلوں کی کوکو، ساغروں کی کھنک، اور بھیرویں گانے والی جوانیوں کی مست دُھنوں پر قدم اُٹھاتا ہوا وہاں پہونچ جاؤں گا جہاں پیری باریاب نہیں ہو سکتی اور جب صبح طالع ہوگی تو میں اُسے اس قدر شگفتہ، سرشار اور مضبوط، ترو تازہ اور جواں ہمت ملوں گا کہ پیری کے پاؤں اُکھڑ جائیں گے۔

ہاں مجھے کوئی قوت، بوڑھا، زرد رُو، اور خشک مزاج نہیں بنا سکتی!

قدرت کی قوی کلائی موڑوں تو سہی ۔۔۔ جی کھول کے وقت کو جھنجھوڑوں تو سہی،
آتی تو ہے، لو آئے مری جانب پیری ۔۔۔ پیری کو کنوئیں جھکا کے چھوڑوں تو سہی

زمانے کی عیّاری

میرے دل کو ایک ایسی محبت ودیعت کی گئی ہے جو بلا کی تلخ و شیریں ہے وہ ایک ایسی آگ ہے جو معشوقہ کے سوا، خود مجھے، اور تمام کائنات کو پھونکے دے رہی ہے۔

زمانہ کی کیسی عدیم النظیر بے مہری اور ستم ظریفی ہے کہ میں پھر اُس ہولناک منصب پر فائز کیا گیا ہوں۔ جسے میں ترک کر چکا تھا۔ ذرا دُنیا کا انصاف دیکھو، سالہا سال کی شب بیداریوں کے بعد، ابھی ابھی میری آنکھ جھپکی تھی کہ اُس کمبخت نے مجھے پھر جگا دیا۔ ابھی ایک قیامت نے دم نہیں لیا تھا کہ دوسری قیامت نے شانے پر لات رکھ دیا۔

ہوائیں بھی کبھی بند ہو جایا کرتی ہیں، مگر دھڑکنے والے دل کو ایک لمحے کے سکون کا بھی حکم نہیں۔

خدا کے لئے انصاف سے کہو، میں نے زمانے سے کب درخواست کی تھی کہ مجھے دوبارہ مزا چکھایا جائے۔ میں عورت، خطرناک جنت۔ انگاروں کی بہشت، پھولوں کا جہنم، یعنی عورت سے قطعیٔ مایوس ہوں۔ یہ دلوں کو توڑ دیتی ہے مگر جوڑ نہیں سکتی۔ جوڑنے میں ایک ایسی کاریگری درکار ہے جو کم از کم عورت کو حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ اُس کی محبت، طوفانی سمندروں سے زیادہ پر جوش ہوتی ہے اور کھرے سونے کی طرح خالص بھی۔ مگر افسوس، صد ہزار افسوس، اس میں پائداری کہاں۔ عورت نازک ہے۔ اور اسی وجہ سے اُس کا پیمانِ محبت بھی نازک ہوتا ہے آبگینے کا ہر جزو

آبگینہ ہی ہوتا ہے۔ میں عورت کی محبت کی ناپائداری کے باعث عورت کو بُرا نہیں سمجھتا لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے پیمانِ وفا نہ باندھے۔ کیونکہ وہ ایک نہ ایک دن ٹوٹ کر میرے دل کو بھی توڑ دے گا۔ مگر ہمارے چاہنے سے ہوتا کیا ہے، زمانہ اپنی مصلحتوں کو خوب سمجھتا ہے۔ وہ ہماری خاطر اپنے نظامِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

کیا میں اُس محبت کو جو زبردستی مجھے دی گئی ہے۔ زمانے کے مُنہ پر مار دوں۔ سینہ چاک کر کے اُسے پھینک دوں؟ کاش میں اس پر قادر ہوتا —— زمانہ جانتا تھا کہ میں محبت کا تلخ تجربہ کر چکا ہوں۔ آسانی سے اُسے دوبارہ قبول نہ کروں گا۔ یہ خیال کر کے اُس نے مجھ سے ایک نہایت شاطرانہ چال چلی، اس گرگِ باراں دیدہ نے مجھ سے کہا لے میں تجھے ایک شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح دیتا ہوں، اس سے دل بہلا۔ میں نے شکریے کے ساتھ اُس "شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح" سے جی بہلانا شروع کیا۔ اور اُسے ایک ادبی مشغلہ سمجھنے لگا لیکن رفتہ رفتہ یہ "شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح" اپنے چہرے سے آہستہ آہستہ نقاب اُٹھانے لگی —— اور جب پورے طور سے نقاب اُٹھ گئی تو معلوم ہوا کہ وہ "شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح" تفریح نہیں، محبت اور خطرناک محبت ہے، جس پر زمانہ کے چالاک ہات نے "تفریح" کی نقاب ڈال دی تھی۔ دیکھو زمانہ کس قدر عیّار ہے۔ لیکن کس سے اِس کی شکایت کروں، یہ ٹھگ تو بادشاہوں تک سے ہاتھ ملاتا ہے کس کے مُنہ میں دانت ہیں کہ اُسے سزا دے —— دیکھو چالاکی یہیں تک ختم نہیں ہوتی ہے۔ ایک چالاکی کے اندر دوسری چالاکی تہ کی ہوئی ہے جو پہلی چالاکی سے بھی لطیف و باریک ہے۔ زمانہ کو پہلے سے علم تھا کہ ایک نہ ایک دن میں اُس کی "شام کی تفریح" کو پہچان جاؤں گا۔ اور پہچانتے ہی نکل بھاگنے کی راہیں سوچنے لگوں گا سو اُس نے بکمالِ عیّاری وہ راہیں پہلے ہی سے بند کر دی تھیں۔ یعنی

اس نے جس پر مجھے فریفتہ کیا تھا، یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ لاکھوں میں ایک ہے، اس کے دام میں ڈوریاں نہیں، زنجیریں ہیں، اور اُسی کے ساتھ ساتھ اس نے اِس نادرۂ روزگار کے ترکش میں نیازمندی و بندہ پروری کے وہ تیر رکھدیئے جو بھاگنے والے کا دُنیا کے ہر حصے میں تعاقب کر سکتے ہیں

بہ دُور گردیٔ من از غرور می خندد

حریفِ سخت کمانے کہ در کمیں دارم

زمانہ خوب جانتا ہے کہ حُسن جب وفا و کرم سے کام لے تو اس کا مارا ہوا پانی تک نہیں مانگ سکتا۔

بہرحال، اب تو میں گرفتار ہو چکا۔ میں رو رہا ہوں اور زمانہ قہقہے مار رہا ہے۔

کیا تو سُننا چاہتا ہے وہ کیسی ہے؟ تو سننا چاہے یا نہ چاہے۔ اس منزل میں جہاں اب میں ہوں، ذکرِ محبوب سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں کرتا۔

وہ کیسی ہے؟ میرا سینہ رُندھا جا رہا ہے۔ مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ حیوانِ ناطق کی یہ کیسی بدبختی ہے کہ جو باتیں کہے جانے کے قابل نہیں ہوتیں۔ اُنھیں وہ کہہ سکتا ہے۔ اور جو باتیں اس قابل ہوتی ہیں کہ کہی جائیں، اُنھیں کہہ نہیں سکتا۔ کیسی بدقسمتی اور محرومی ہے کہ معنی کے آفتاب کا سامنا ہوتے ہی الفاظ کی شبنم اُڑ جاتی ہے۔ آہ اے گُونگے انسان! تو زباندانی کا مُدعی ہے۔

زبان ایک گنوار خادمہ ہے جو پیتل اور تانبے کے برتن کو راکھ سے مانجھ سکتی ہے مگر چینی اور شیشے کے ظروف توڑ ڈالتی ہے۔

ہاں تو وہ کیسی ہے؟ وہ انگوری شراب ہے، جو کسی دیوی کی دُعا سے انسانی پیکر

میں جلوہ فروش ہوگئی ہے۔ وہ خالقِ عالم کا تصورِ بہشت ہے جس نے جسم کی صورت اختیار کرلی ہے، وہ شاعری کی روح ہے جس نے گوشت پوست کا رنگین لباس پہن لیا ہے ——— اُس کی جِلد، خدا جانتا ہے، اس میں مبالغہ نہیں دُودھ پیتے بچوں کی جِلد سے زیادہ چکنی اور ملائم ہے۔ میں نے اُس کی جِلد کو مَس کرکے فوراً گلاب کی پنکھڑی کو مَس کیا (اگر مبالغہ کرتا ہوں تو میرا حشر ظالموں کے ساتھ ہو) اور میں نے یہ بیّن فرق محسوس کیا کہ میری محبوبہ کی جِلد، پنکھڑی سے بھی زیادہ ہموار چکنی اور نرم ہے۔ میرے مَس نے اُس سے زیادہ نرم شے کا آج تک تجربہ نہیں کیا ہے۔ اُس کا چہرہ یونانی دیویوں سے زیادہ ملتا ہے، اور دنیا کے منتخب ترین مصوّروں کا آئیڈیل بن سکتا ہے۔ اُس کی گردن ہنس کی سی ہے۔ ذرا سا خم لئے ہوئے جس میں تلوار کی سی لچک اور رقص کرتے ہوئے طاؤس کا سا بانکپن ہے۔ جب وہ بات کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تاروں کی چھاؤں میں کسی دُور کے مندر کے اندر چاندی کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اُس کا تبسّم، دل کے ساتھ وہ کرتا ہے جو قحط زدہ زمین کے ساتھ رُوم جھوم کر برسنے والی گھٹا کرتی ہے۔

ملبوس کے اندر سے اُس کے گورے پنڈے کا گلابی پن کس لطافت کے ساتھ چھنتا رہتا ہے۔ اُس کے پنکھڑی سے زیادہ کاریگری کے ساتھ ترشے ہوئے لبوں کی خوشبو ایسی ہے، جن سے پھولوں کی دُنیا ناواقف ہے، اُس کی آنکھیں، کائنات دراغوش آنکھیں کتنی مخمور، مست، ساحر، اور عمیق ہیں۔ اُن میں کتنے جادوؤں کا مسکن اور کتنے منتروں کا آشیانہ ہے۔ اُس کی دراز پلکوں میں شراب کی موجیں ہیں، ابر کا خرام ہے، اور روح کی کروٹیں ——— وہ ایک آہوئے صحرا ہے جس کی ملائم مگر

سمندر سے زیادہ گہری آنکھوں کے سامنے تیر مقتول نظر آتے ہیں۔

میں نے ایک روز منہ اندھیرے، جب مرغ بانگ دے رہے تھے، اُسے دیکھا، یہ پہلا موقع تھا کہ میری رُوح کو معلوم ہوا کہ آسودگی کسے کہتے ہیں اگر میں راسخ العقیدہ مسلمان ہوتا تو صبح کے وقت اس کی طرف دیکھنے کی جسارت نہ کرتا۔ کیونکہ میری محبوبہ صبح صادق کی حقیقی بہن ہے، اور اسلام نے دو بہنوں کا جمع کرنا حرام ٹھہرایا ہے

یہ ہے سرسری اور بھدا ساخاکا اُس نادرۂ روزگار کا جس کے حوالے زمانہ نے مجھے کیا ہے —— اب خود سوچو، میں بھاگوں تو کیونکر، اور اب جبکہ اچھی طرح معاملات میں نے بیان کر دئے ہیں، زمانہ کو داد دو کہ اس نے کیسی کامیاب عیاری سے مجھے پھر ہات پاؤں باندھ کر حسن کے قدموں پر ڈال دیا ہے۔

اُردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت

نوعِ انسانی کے مُصلح بننے کا خیال، کس قدر مضحکہ خیز خیال ہے! انسان انسان کی اصلاح کر سکتا ہے؟ کیا یہ محض واہمہ نہیں جو صرف بہکی ہوئی ذہنیت ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے؟

میں پوچھتا ہوں، انسان خود اپنی اصلاح بھی کر سکتا ہے؟ اور کیا یہ ایک عریاں حقیقت نہیں ہے کہ انسان خود اپنی اصلاح کے باب میں بھی قطعی بے دست و پا ہے؟ اور اس بے دست و پائی کے باوجود، نوعِ انسانی کی اصلاح کے خواب دیکھنا مسخرگی نہیں تو کیا ہے۔

"تو بہ خویشتن چہ کردی، کہ بما کنی نظیری؟"

افسوس، اے مجبور و ناچار انسان! افسوس، کاش تو اپنی ہی اصلاح کر سکتا، لیکن ——— او نامراد تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا،

میں اربابِ عقل و عمل سے دریافت کرتا ہوں کہ اس مجبوری کے باوجود، اور اس بیچارگی کے باوصف، ہمارا انسانوں کے مصلح بننے کا تخیل، کیا عظیم الشان قدرت کی بارگاہ میں ایک احمقانہ اور ناقابلِ عفو گستاخی نہیں؟

انسان تو اس عظیم المرتبت کرۂ ارض کا فرزند، اور اس عظمت آفریں نظامِ شمسی

کا بچہ ہے، جو سنگ ریزوں کو جواہر پاروں، اور مادۂ بے حقیقت کو پیکرِ انسانی میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ قدرت، انسان کی دایہ ہے، وقت اُس کا معلّم ہے، طلوع و غروب اسکی درسگاہیں اور ماہ و سال اُس کے درسیات ہیں"

کیا وہ "ماہتاب اندر عنان و آفتاب اندر رکاب"، قوّت، جو اِس کارخانۂ عظیم عالم کو چلا رہی ہے۔ اِس قدر ٹھنڈی اور کمزور واقع ہوئی ہے کہ کسی مصلح کی دخل اندازی، اور کسی برخود غلط راہبر کی گستاخی برداشت کرلے گی؟

کیا انسان، موجِ نفس پر تھرتھرانے والے حباب "انسان" کو یہ معلوم نہیں کہ اِس پُرسطوت گردش کرنے والے کرۂ ارض میں جو کچھ ہورہا ہے، منشائے قدرت کے عین مطابق ہورہا ہے؟

کیا، جو پُرزا جہاں بٹھا دیا گیا ہے، وہی اُس کا بہترین مقام، اور جو حرکت اُس کی مقرر کردی گئی ہے، وہی اُس کا وظیفۂ فطری نہیں ہے؟

ہم انسانوں کے اعمال، اور اشیائے عالم کے خواص پر "خیر" و "شر" کے لیبل لگانے والے کون ہوتے ہیں؟

اِک مرد، حق آگاہ نظر آتا ہے | اِک کافر و گمراہ نظر آتا ہے
اس کہنہ سرا میں ہر بد و نیک مجھے | مامور من اللہ نظر آتا ہے

میں پوچھتا ہوں، اِس زمین کی، جو اپنی چھاتی پر پہاڑ اُٹھائے ہوئے ہے، ہر چھوٹی سے چھوٹی جنبش، اور اِس آسمان کی، جو تمام عالم کو ڈھانپے ہوئے ہے، ہر ادنیٰ سی حرکت، کیا ایک پوشیدہ مگر مکمل قانون سے جکڑی ہوئی نہیں ہے؟

کیا وہ تمام سفّاک و رحمدل، ہولناک و دلفریب، اور ناقابلِ تصورِ عظیم قوّتیں، جو

بکھرے ہوئے آوارہ مزاج و شریر عناصر کے دہانوں میں لگا میں دیے ہوئے ہیں،
انسان کی سی زمین پر رینگنے والی مخلوق کے کھوکھلے اصطلاحاتِ "زشت" و "خوب"
کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنے، اور انسانوں کی بنائی ہوئی بے مغز سوسائٹی کی مفروضات
"اوامر" و "نواہی" کے سامنے سپر انداختہ ہو جانے پر آمادہ ہو سکتی ہیں؟

کیا وقت کا پہیا، جس کی نگرانی میں ماہ و سال کی پُرفن کمانیاں، ایک مقررہ رفتار
کے ساتھ کھلتی رہتی ہیں، اتنی بعید از قیاس سرعت کے ساتھ نہیں گھوم رہا ہے کہ اس کی
سُبک تیلیوں کو دنیا کی سب سے بڑی خوردبین بھی نہیں دیکھ سکتی اور کیا وقت کی
اِس تند و تیز رو اور آب روز و شب کے اس دریڑے میں دنیا کا ہر سفید و سیاہ اور عالم
کا ہر خشک و تر، جس میں آدمی بھی ایک ہے، منشائے قدرت کے سانچوں میں برابر ڈھلتا
نہیں چلا جا رہا ہے؟

کیا ہم اس سلسلۂ عمل کو چھو سکتے ہیں؟ —— کیا ہمارا جذبہ اصلاح، اس پُرہول
مشینری کے نکیلے اور گرم دندانوں کی گرفت سے انسان کو چھڑا لینے کی قوت رکھتا ہے؟
کیا ہم قدرت کی بلند اور اسرار کے کہرے میں چھپی ہوئی تربیت گاہ میں نقب لگا کر داخل
ہو سکتے ہیں؟ اور کیا شہر یارِ حیات یعنی وقت کے مکتبِ پنہاں سے ہم اُس کے طلاب کا
اغوا کر سکتے ہیں؟

قطبین کے درمیان کون ایسا سورما ہے جو خم ٹھونک کر، اور غرور سے گردن کو کج
کر کے سامنے آئے، اور جواب دے "ہاں، میں ایسا کرتا ہوں"؟

میں بہ آوازِ بلند پوچھتا ہوں، کس کی مجال ہے اور کس میں یہ جرأت ہے کہ انسان
کو آغوشِ قدرت سے چھین کر اپنی گود میں اٹھا لے؟

اگر کوئی ایسا ساونت ہے، میں اُسے چیلنج دیتا ہوں، مردوں کی طرح سامنے آئے۔ یہ ہے بارگاہِ قدرت!

ایں است کہ دل بُردۂ خوں کردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

ہاں ایسی کوششیں کی جا چکی ہیں، دنیا ایسے صدہا ناکام تجربہ دیکھے ہوئے ہے۔ دنیا کی عظیم ترین "مصلحوں" کے کارنامے، دنیا کی میز پر کھلے ہوئے رکھے ہیں۔

تاریخ کے بوسیدہ قصر کا دروازہ کھولئے، اس کے خاک آلودہ دفتر پارینہ کی ورق گردانی کیجئے، اور دیکھ لیجئے کہ اکابر مصلحین کی نامرادیاں کس قدر جلی حروف میں لکھی ہوئی ہیں اور ان کے نوشتوں کے سرِورق کے ابھرے ہوئے الفاظ میں درج ہے۔

السّلام اے بعد ما آیندگان رفتنی
بر شما خوش باد نا خوشہائے دنیائے دنی

خدا کرے مصلحین پر، ان نوعِ انسانی کے محسنوں کی وقتی کامیابیوں کی پرچھائیوں پر نہ جائیے۔ "خوش درخشید، ولے دولتِ مستعجل بود" کی کرشمہ سازیوں کو اہمیت نہ دیجئے۔ اور عقلمندوں کی طرح اُس "روشنی" کو روشنی کیوں کہئیے۔ جو "برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم" کے مانند عارضی ونا پائیدار ہوا کرتی ہے؟

دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ان مصلحوں نے "نوعِ انسانی کی قلبِ ماہیت کردی تھی؟ کیا یہ گروہ، فطرتِ انسانی پر قابو یافتہ ہو گیا تھا؟ اور کیا ان "مصلحین" کے انسان کو قدرت کے آغوش سے چھین کر اپنے سایۂ تربیت میں لے لیا تھا؟

اور کیا اس سوال کا جواب، اثبات میں دیکر ہم مجنونوں کی صف میں بیٹھنے کے

قابل نہو جائیں گے؟ کیا اتنے مصلحوں اور ہادیوں کی سرگرمیوں کے باوصف، دنیا آج تک اُسی روش پر قائم نہیں ہے جس روش پر فطرت اُسے چلا رہی ہے؟

کیا انسانیت اپنے نئے اور پُرانے ہادیوں کی گرفت میں ہے؟

ہاں نوعِ بشر جبیں بہ جبیں ہے اب تک
انسان "رہِ راست" پر نہیں ہے اب تک
اللہ کو ہو مژدہ کہ "سرکش" بندہ
تھا روزِ ازل جہاں، وہیں ہے اب تک

زمانے کے ایوان، اور تاریخ کی محراب میں اب تک شکست خوردہ آوازیں گونج رہی ہیں، ان غریب "مصلحین" کی جو نورانی چہروں، محیّر العقول قوتوں، فصیح خطبوں، مضبوط سیرتوں، مقدس ارادوں، شفا بخش کلموں اور اپنے معتقدین کے سرفروش لشکروں کے ساتھ رُشد و ہدایات کے آسمانی طبل پر چوبیں لگاتے ہوئے، حیات کے اُفق پر، ماہتاب در بغل، اور آفتاب بر کف، طالع ہوئے تھے۔ —— لیکن،

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"!

آؤ میں تمہیں مصلحین کی روحوں کی آواز سناؤں"

دم بھر بھی ہمیں صبر کا یارا نہوا
پورا کوئی ارمان ہمارا نہوا
اصلاح کی ہمنے تو بہت کی کوشش
لیکن تری حکمت کو گوارا نہوا

بتایا جا چکا ہے کہ انسان، فطرت کا بچہ ہے، اور تمام انسانی گرفتوں سے

بالاتر واقع ہے ۔ بیچارے مصلحین، خدا ان کی ہڈیوں کو محفوظ رکھے، زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتے ہیں کہ اپنی پیشانیوں سے ناکامی کا پسینہ پونچھ ڈالیں اور بس!

ہاں مشغلۂ جام و سبُو جاری ہے
اب تک وہی رسمِ ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انسان سے ٹکر ایسی
ہر دین کے ماتھے سے لہو جاری ہے

فطرت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے، فطرت کی حکمرانی ازل سے شروع ہوئی ہے، اور ابد تک جاری رہے گی۔

گل پر ہیں نقوشِ دستِ باری اب تک
جنباں ہے دلِ بادِ بہاری اب تک
انسان کی پیمبری کا در ہے مسدود
فطرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

ذرا، مصلحین کے پیروؤں کے دفتروں کو کھول کر دیکھئے جو روشنائی کے عوض، انسانی خون سے لکھے گئے ہیں۔ انسان کی بربادی، تباہی، دردمندی، اور ہلاکت کے واقعات ایک ایک کر کے، ٹھہر ٹھہر کر، صبر کے ساتھ پڑھیے، ایک ایک سُرخی اور ایک ایک مد کو جانچیے، ہر اجمال پر تفصیلی نظر ڈالیے، اور پھر دریافت کیجیے کہ اتنی زبردست بربادیوں کے بعد اولادِ آدم کو مِلا کیا؟

میں خود کچھ عرض نہ کروں گا، آپ خود اپنی قوّت فیصلہ اور شعورِ استنباط سے پوچھیے البتہ میری جانب سے اس قدر ضرور یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اگر آپ کی قوّت فیصلہ د

ہم پرست عورتوں کی طرح سہمی ہوئی نہیں ہے، تو وہ آپ کو گمراہ کن جواب دینے کی جسارت ہرگز نہ کرسکے گی۔

اور اب، جب کہ نوعِ انسانی کی اصلاح کے باب میں ہماری بیچارگی اس قدر نمایاں، اور ہمارا عجز اس قدر غیر مبہم طور سے ہمارے سامنے آچکا ہے، تو ہمیں اپنے دماغ کی قوتوں کو یکجا کرکے غور کرنا ہے کہ ہمارے سامنے کونسا راستہ کھلا ہوا ہے۔ یعنی

"چیست یاران طریقت! بعد ازیں تدبیر ما؟"

کیا ہم دنیا کے سب سے بڑے مُغنّی حافظ شیرازی کی "حدیث از مُطرب و مے گو" پر کاربند ہوکر خاموش ہوجائیں؟ بے علمی پر قناعت کرلیں؟ — "حدیث از مُطرب و مے گو" پر عمل تو کیا جاسکتا ہے اور اس وقت بھی تندرست ذہن کے مالک عقلاء کے حلقے میں اس پر عمل ہو رہا ہے، لیکن اس کا دوسرا حصّہ، یعنی "خاموش ہوجائیں"؟ بے علمی پر قناعت کرلیں؟ قطعی طور پر ناقابلِ عمل ہے

انسان سب کچھ ہوسکتا ہے، لیکن خاموش و بے عمل کبھی نہیں ہوسکتا — حرکت اس کی زندگی ہے اور سکون موت — وہ تو روزِ ازل کی صبحِ صادق سے "حالیا غلغلۂ در گنبدِ افلاک انداز" کے ترانے گا رہا ہے، اور جب تک موت اُسے بظاہر خاموش نہ کردیگی، وہ یہی ترانے گاتا رہے گا۔ "بظاہر" میں اس لئے کہتا ہوں، کہ کون کہہ سکتا ہے کہ ع۔ خود موت بھی خواب ہے، کہ بیداری ہے؟ اور جبکہ سکون و اضمحلال اور جمود و تعطّل، انسان کے واسطے ناممکنات میں سے ہے، تو قرینِ دانشوری یہی ہے، یا یوں کہیئے ہم اس پر مجبور ہیں کہ انسان کو مصروف و مشغول ہی رہنے کا مشورہ دیں۔ کیونکہ یہ مشورہ تو خود ہماری عین فطرت ہے۔

لیکن اس منزل پر کیا ہم دنیا کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ لانیحل، اور سب سے زیادہ قدیم مشکل سے دوچار نہیں ہو جاتے؟ یعنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان، اب تک، اس لمحے تک، اپنی غایتِ تخلیق ہی سے ناواقفِ محض ہے، تو پھر اس سادہ ہموار صورتِ حال میں کیا ہم اس کے سامنے واقعیً کوئی ٹھوس اور حقیقی کام پیش بھی کر سکتے ہیں؟

صدیوں اور قرنوں سے اِس نیلے آسمان کی پُر رعب ڈانٹ کے نیچے، ,,صنّاعِ مرا، بہر چہ آراست، مرا؟ کی آوازیں گونج رہی ہیں، ,,پیغامبر،، خاموش ہیں، ,,صحائف نقش بدیوار ہیں، اور فلاسفہ سرمہ در گلو ——— آخر کس سے دریافت کیا جائے؟ کس سے پوچھا جائے؛ کس ماں نے آج تک کسی جاننے والے کو جنا ہے؟ ہر طرف کامل خاموشی زبردست سکوت، اور اتھاہ سناٹا ہے ——— اور غریب انسان۔ مشیت کا سوتیلا بیٹا انسان ,,کہ سربکوہ و بیاباں تو دادۂ مارا،، کار دنار دتا ہوا تحقیق کی تاریک دنا ہموار وادیوں میں سر پھوڑتا پھر رہا ہے، اور ہر منزل، ہر قدم پر ,,معلوم مم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد،، کی دردناک چیخ اس کی زبان سے نکل جاتی ہے

وائے اے ذوقِ تحقیق! حیف اے دردمند انسانیت!!

یہ عقلِ زبوں، مٹا کے چھوڑیگی ہمیں
یہ آتشِ غم، جلا کے چھوڑیگی ہمیں
یہ راز کی پیاس، دل کا پی لیگی لہو
یہ علم کی بھوک، کھا کے چھوڑیگی ہمیں

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، یا دردمند دل کی آہ، جو منھ سے نکل گئی ———

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب تک علّتِ ایجاد کا پتہ نہ چلے گا، جس کی اُمید ،، ایں خیال است

ومحال است وجنوں ،، کی حد تک موہوم ہے، اُس وقت تک انسان اپنے زعم میں

خواہ کوئی کتنا ہی ٹھوس اور سنجیدہ کام کیوں ہو اختیار کرے، لیکن حقیقت شناس طبقے میں

اُس "ٹھوس،، اور ،، سنجیدہ،، کام کو "شغلِ بیکاری،، سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی

کہنے والے نے کہا ہے، اور سچ کہا ہے۔

انسان کی جس قدر بھی طراری ہے
بس وقت گزارنے کی بیماری ہے
افسوس کہ بے معرفتِ رازِ حیات
جینا کتنی شدید بیکاری ہے

"شغلِ بیکاری،، اور خلیفۂ ارض ووارثِ کائنات انسان"!

کتنا غیر مشفقانہ برتاؤ! کتنا دردناک کھیل!!

اور جب "شغل بیکاری،، ہی کے نقطے پر ہمارے تمام اعمال کی گردش منحصر ہے،

تو آیئے، زندگی کو بہلانے، اور بچّے کے ہاتھ میں کھلونا دینے کی خاطر، دنیا کے ناقابلِ شمار،

مشاغل میں سے کوئی ایسا شغل کیوں نہ منتخب کر لیں جس پر ہم "بہترین شغل،، کی مہرِ تصدیق

ثبت کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہوں؟

لیکن انفرادی و اجتماعی، دونوں جہتوں سے اِس کا کوئی ایک حل، یا ایک جواب

بعید دشوار معلوم ہوتا ہے ـــــــــــ البتہ اِس سلسلہ میں بلا خوفِ تردید اتنا ضرور کہا جا

سکتا ہے، ممکن ہے میں غلطی پر ہوں، کہ جن جواں بخت، یا بدقسمت افراد کی سطحِ فکر کافی بلند

اور جن کے ذہن کی دھار کافی باریک اور تیز واقع ہوئی ہے، اُن کے واسطے کارخانۂ عالم

میں تفکر وتدبر سے بہتر کوئی دوسرا مشغلہ اُس وقت تک انسانی حدود معلومات میں داخل نہیں ہوا ہے اور یہی وہ تنہا مشغلہ ہے، جس سے ہم خدمتِ انسانی کی بہترین آرزوؤں کو وابستہ کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ اعتراض قدرتی طور سے پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مان لیا گیا ہے کہ انسان کی اصلاح، انسان کے بس کا روگ نہیں، تو پھر مشغلہ تدبُّر و تفکُّر سے خدمتِ انسانی کی بہترین آرزوؤں" کی وابستگی کیا معنی رکھ سکتی ہے؟۔

سنئے میں عرض کرتا ہوں ۔ بات یہ ہے، اور ارباب بصیرت عقلی، اور زیادہ تر، وجدانی طور پر اس سے بخوبی آگاہ ہیں، بلکہ تجربے بھی کر چکے ہیں کہ زمانہ اپنی مسلسل وپیہم رو میں چلتے چلتے خود بخود ایک ایسی موڑ پر آجایا کرتا ہے جہاں سے تو بہ تو انقلابات کے دروازے خود بخود کھلنے لگتے ہیں ــــ اور مفکرین کے سینوں میں ان کا عکس تھر تھرانے لگتا ہے۔ یعنی زمانے کے اس موڑ کے معنی یہ ہیں کہ اب قدرت خود اصلاح یا انقلاب پر تیار ہو چکی ہے اور مفکرین کو تعاون پر آمادہ کر رہی ہے

عوام ان انقلابی آثار و قرائن کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اُن کی موٹی نگاہ زمانے کو مڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن جس طرح آلات کے ذریعے سے ستاروں کی گردش، شمس و قمر کی رفتار، موسموں کے تغیرات، قحط و بارش کے آثار۔ آندھیوں طوفانوں اور زلزلوں کی آمد کا حال معلوم کر لیا جاتا ہے، ٹھیک اُسی طرح، اور اسی انداز پر، مفکرین کی بصیرت، آنے والے انقلابات کا پہلے ہی سے مشاہدہ کر لیتی ہے۔ وہ فضا میں انقلاب کو دیکھ، اور ہوا میں انقلاب کو سونگھ لیتے ہیں۔ اور جیسے ہی زمین سے خفیف بھاپ اُٹھنے لگتی ہے، وہ اہل خرمن کو آگاہ کر دیتے ہیں کہ برقِ خرمن سوز سے ہوشیار ــ اور جب آنے

والے انقلابات کے تیور پہچان کر وہ ان کی افتادِ مزاج کا صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں، تو منشائے قدرت کے زیرِ سایہ ہر ممکن عجلت کے ساتھ انقلابی سرگرمیاں شروع کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس شدّت کے ساتھ کہ سُست رفتار زمانے کی رَو میں، جو انقلاب ممکن ہے، کل رونما ہوتا، وہ اُن کے مساعی کی بدولت آج ہی پیدا ہو جاتا ہے اور اس طور پر مفکّرین، زمانے کو اس کے عزائم میں مددگار، انسان کی بہترین خدمت انجام دیتے ہیں اور وہ "مصلحین" کے خطاب سے سرفراز کیے جاتے ہیں۔

اس کو اس مثال سے سمجھئے، فرض کیجیے زمانہ ایک مطلق العنان بادشاہ ہے اور مفکرین اس کے مزاجداں مقربین میں سے ہیں — بادشاہ کے دل میں جیسے ہی کوئی انقلابی یا اصلاحی جذبہ پیدا ہوتا ہے، یہ معاً اُس کے تیوروں سے پہچان جاتے ہیں یا یوں کہیے بادشاہ خود اپنے تیوروں سے اُنھیں پہچنوا دیتا ہے اور گروہِ مفکرین ان آثار کو پاتے ہی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس سرگرمی سے جدوجہد شروع کر دیتا ہے، کہ بادشاہ کا عزم بہت ہی جلد عملی جامہ پہن لیتا ہے، اور وہ انقلاب، جو خدا جانے ضمیرِ شاہ میں کب تک پہلو بدلتا رہتا، ان کی مستعدی کی بدولت جلد تر رونما ہو جاتا ہے

اب آپ سمجھے کہ شغلِ تدبّر و تفکّر سے میں نے، خدمتِ انسانی کی بہترین آرزوؤں کو کیوں وابستہ کیا تھا؟

یہی حال آجکل ہندوستان کا ہے۔ ممکن ہے کسی کو نظر نہ آتا ہو، لیکن اربابِ نظر ہندوستان میں زمانے کو یوں مڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جیسے پیچ و خم کھاتی ہوئی پٹری پر ریل مڑتی نظر آتی ہے، اور اس صفائی کے ساتھ کہ گارڈ کے ڈبے سے انجن نظر آنے لگتا ہے۔ ہاں۔

لذتِ سیر و گر چشمِ تماشا لیگی
ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لیگی

لیکن ہندوستانیو! تمہاری سماعت کو کس طرح طوفانی بجلی کی کڑک اُچک لیگئی ہے؟ کیا واقعیٔ تم نہیں سنتے کہ ہندوستان کی ہواؤں میں انقلاب سانس لے رہا ہے۔ سنسنا رہا ہے راستے کے موڑ پر ہندوستان کے قدموں کی چاپ سنائی دیرہی ہے؟

اور کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جب رات کا پراسرار سناٹا، پہنائے عالم کا احاطہ کرلیتا ہے، تو نہ معلوم سمتوں سے "انقلاب" انقلاب کی دھیمی آوازیں صبح تک آتی رہتی ہیں۔ ہندوستانیو! تمہاری بصارت کو کس کی نظر کھا گئی ہے؟ کیا واقعی تم نہیں دیکھتے کہ ہندوستان کی دھوپ اور چاندنی میں انقلاب جھل جھلا رہا ہے؟

اور اے زمین کے عجیب ترین باشندو، اہلِ ہند! تمہاری قوتِ شامہ کو کس زہر نے سُن کر دیا ہے؟ کیا تمہاری سانس تمہیں خبر نہیں دیتی کہ ہندوستان کے گلزاروں میں انقلاب بوئے گل بن کر فضاؤں میں مچل رہا ہے؟

اور خدارا بتاؤ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ سینۂ ہندوستان میں انقلاب کا جو سُرخ شعلہ آہستہ آہستہ تھرتھرا رہا ہے، اسے ہوا دینا شروع کر دیا جائے؟ — انقلاب انقلاب ہر شے میں انقلاب۔ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب۔ آداب و رسُوم میں انقلاب نظریات و معتقدات میں انقلاب۔ مُسلّمات و کلیات میں انقلاب۔ سیاسیات و مذہبیات میں انقلاب۔ یکسر انقلاب۔ تمام تر انقلاب۔ اور مُکمّل انقلاب۔

لیکن آپ جانتے ہیں ان تمام انقلابات کا سرچشمہ کہاں ہے؟ نفسیات سے پوچھیے، وہ جواب دیگی کہ انسان کے ذہن و خیال اور صحیح فکر میں"

جب تک "ذہن و خیال" میں انقلاب نہ آئے گا، کسی نوع کے انقلاب کی امید رکھنا ایک مہمل سی بات ہے۔

لیکن اس "ذہنی" انقلاب کا سرچشمہ کہاں ہے؟ دنیا کی زندہ اور مردہ قوموں کی تاریخ سے سوال کیجئے، وہ جواب دیگی "قوموں کے ادبیات" میں!

اس لئے آیئے، اپنے ادبیات کا جائزہ لیں اور دیکھیں اس مجموعے میں زندگی و بیداری پیدا کرنے کی صلاحیت کہاں تک پائی جاتی ہے؟

لیکن ایک ہزار بار کی دیکھی۔ جانچی اور پرکھی ہوئی چیز کا جائزہ کیوں لیجیے؟ ہمارے ادبیات میں ہے کیا؟ وہی روایتی، مصنوعی اور بے سمجھے بوجھے حسن و عشق کے چٹخارے وہی نارواقناعت اور ترک دنیا کے چبائے ہوئے نوالے وہی "اگر شہ روز را گوید شب ایں است" کی غلامانہ تعلیم وہی "ما مقیمانِ کوئے دلداریم" کی لوریاں۔ وہی "گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے" کی بزدلی۔ وہی "رات بھر لاشہ پڑا رکھا مسیحانے مرا" کی کفن فروشیاں۔ وہی "یار کا سر چڑھ کے بوسہ لے لیا" کی بولی ٹھولی "وہی" ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" کا ہلانہ بے پروائیاں۔ وہی لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی" کی بے غیرتیاں وہی "ایسے ہیں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو" کی سوقیانہ بول چال۔ وہی "اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے" کی زبوں ہمتی۔ وہی کارسازِ ما بفکرِ کار ما" کی نوم آور دوائیں اور وہی "بہت سعی کیجئے تو مر رہیے میر بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے" کی نسائی ناچاریاں۔

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر جواب دیجئے کیا ہم ان رانڈوں کی طرح بین کرتی اور سوگوار بوڑھیوں کی طرح چھاتی پیٹتی ہوئی، جھوٹے آنسوؤں کی شاعری سے طوفانی

سمندروں کے تڑپتے ہوئے سینوں پر جہاز چلا سکتے ہیں؟

جس شاعری کی ٹڑیاں، زنداں کی زنجیروں سے کھُرچ کھُرچ کر نکالی جاتی ہوں جس کی سفید آنکھیں ہمیشہ چھت سے لگی رہتی ہوں، جو حقیقی حسن و عشق کی چاشنی سے بیگانہ ہو، جو اس زندگی اور اُس کے تمام بے شمار پہلوؤں کے مطالعے اور اس عظیم الشان کرۂ ارض کے مشاہدے سے قاصر ہو۔ جس کے آشیاں پر آئے دن بجلیاں گرا کرتی ہو جسے ہر بازاری آدمی، اگر وہ رقیب کی صورت سے نمودار ہوا ہے۔ دھکے دیکر بزم سے نکال سکتا ہو، جو دل کا جنازہ ہتیلی پر لئے پھرتی ہو، جس کی سانس سے شگفتگی کا چہرہ اُتر جاتا ہو۔ جس کا ہر روز "عشرۂ محرّم" اور جس کی ہر شب "شبِ شہادت" کے مانند ہو، اور جس کی تھرتھرائی ہوئی آواز ایسی ہو گویا آندھی کے وقت ٹوٹی ہوئی قبروں کے روزنوں سے ہوا گزر رہی ہے، کیا ایسی فاقوں کی ماری، اونگھتی، بلبلاتی، تھرتھراتی، گڑگڑاتی کانپتی، روتی، پیٹتی، چیختی، چلاتی، سسکتی، بسورتی، بلکتی اور لنگڑاتی ہوئی شاعری کے کاندھے پر ہات رکھ کر ہم زندگی کے پُر ہول و ناہموار میدانوں کے طے کرنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں؟ ایک بار نہیں، ہزاروں مرتبہ، طویل راتوں کے سکون اور سناٹوں میں مینے اُردو شاعری کا مطالعہ کیا۔ مینے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے اساتذہ کے سینے کھولکر دیکھے۔ مینے پوری دیانت کے ساتھ اپنے شعرار کی نبضوں پر ہات رکھ کر ان کی ضربات کا شمار کیا۔ لیکن افسوس کہ مجھے ان کے اندر زندگی، شعلہ فشاں زندگی، آگ اور بجلی سے کھیلنے والی زندگی، گرجتی گونجتی ہر قدم پر مچلتی اور ابھرتی ہوئی سُرخ خون والی زندگی کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔

ہمارے کلیات، دواوین، ناول، اور افسانے، زہر پر کے گرے ہیں، جہاں

حیات کا خون جم جاتا ہے اور ولولوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں۔

کہاں تک روؤں؟ کس کس بات کا ماتم کروں؟ ذرا اپنے "شعرائے کرام" کے تخلص ہی ملاحظہ فرما لیجیے اور کسی ماہر نفسیات سے دریافت فرمائیے کہ یہ تخلص کس نوع کی ذہنیت پیش کرتے ہیں، آپ جانتے ہیں اس کا جواب کیا ہوگا؟

وہ غیر مشتبہ الفاظ میں بتا دیگا کہ اس نوع کے تخلص صرف وہی لوگ پسند اور اختیار کر سکتے ہیں جن کے ولولوں کی کمریں ٹوٹ چکیں اور جنگی ہمتوں کے منکے ڈھل چکے ہیں۔

سُنئے اور عبرت کے کانوں سے سُنئے۔

مجروح، تفتہ، مُلول، سکین، درد، سوز، ذرہ، نخچیر، داغ، افسوس، حزیں، عدم، بیدم، بسمل، کشتہ، الم، اشک، آہ، قلق، اور یاس وغیرہ ما

اور لگے ہاتھوں ان شعراء کے کلام سے متاثر ہونے والے ادیبوں کے ان سابقوں کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو وہ بالعموم خطوں میں اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ناچیز، ذلیل، حقیر، فقیر، احقر، رسوا، کمترین، فدوی، عبدِ ذلیل، ہیچ میرز، بندۂ بے نوا، کمترینِ خلائق، اذلِ مخلوق، احقر العباد، عاجز، ہیچمداں، گناہگار، عاصی، پر معاصی اور روسیاہ وغیرہ!

کیا آپ اپنے شاعروں اور ادیبوں کی پست ذہنیت کے سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ کسی ثبوت یا شہادت کے طلبگار رہیں؟

آخر صاف صاف کیوں نہ کہدیا جائے کہ ہمارا ادب کمزور ہے۔ علیل ہے، خوابیدہ ہے، مقلد ہے، نقال ہے۔ غیر فطری ہے بے روح ہے۔ مدقوق کی طرح زرد، مبروص

کی طرح داغدار، مفلوج کی طرح اپاہج، اور سڑی ہوئی لاش کی طرح متعفن ہے؟

ہاں میں آپ کے سامنے شاعری ہی کے کیمپ سے آیا ہوں، نہ میں غدار ہوں نہ خدانخواستہ مغرب زدہ۔ ایسا معلوم تو ضرور ہوتا ہے کہ کچھ شعر کہنا اور سمجھنا جانتا بھی ہوں۔ میری طرف سے اِس وہم میں نہ پڑیئے کہ میری نظریں اپنی شاعری کے اُن اثر آفریں اور نازک پہلوؤں پر نہیں ہیں۔ جو دلوں میں اُتر جاتے ہیں۔ لیکن آپ کو غالباً ایک شاعر کی زبان سے یہ سن کر بہت استعجاب ہوگا کہ میں سر دست اپنی قوم میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ "دل" دماغ پر غلبہ حاصل کئے رہے۔

"دل" ایشیا کا بہت پرانا اور ہر دلعزیز فرمانبردا ہے۔ لیکن حالاتِ موجودہ کی عمرانی اور سیاسی پیچیدگیوں، اور عصر حاضر کے مقتضیات پر نگاہ کرتے ہوئے میں ایشیا کے اس شریف اور بوڑھے تاجدار کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ بمراحم خسروانہ، تھوڑے دن کے لئے، تاج و تخت سے اپنی دست برداری کا اعلان کردے۔

ہر چند یہ مشورہ دیتے ہوئے "دل را بدل رہیست" کے مطابق خود میرا دل بھی درد محسوس کرتا ہے۔ لیکن زندگی کی ضرورتیں جب ہٹ پر آجاتی ہیں، تو ان کے قدموں پر دل و جان دونوں کو نچھاور کر دینا پڑتا ہے۔ اور اس وقت ہندوستانی زندگی کی ضرورتیں جان و دل ہی کی قربانی کے لئے مچلی ہوئی ہیں۔

میں حیران ہوں کیا آپ واقعی نہیں دیکھتے کہ ہندوستان ننگا اور بھوکا ہے دانے دانے کو ترس رہا ہے؟

کیا آپکے علم میں یہ اب تک نہیں آیا ہے کہ اکثر و بیشتر ہندوستانی مائیں، بھوک سے تنگ آکر اپنے کلیجے کے ٹکروں کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ذبح کر ڈالتی ہیں؟

کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ ہر سال آپ کے کتنے گریجویٹ بے روزگاری سے گھبرا کر زہر کھا لیتے ہیں؟

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آپ کی عورتیں مدقوق، جاہل اور فنِ تربیتِ اولاد سے قطعی بیگانہ ہیں۔

کیا آپ کو نظر نہیں آتا ہے کہ آپ کے نوجوانوں کے چہرے اُترے ہوئے ہیں، جن پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں؟

اور کیا واقعی آپ کو اس حقیقتِ کبریٰ کی اس لمحے تک خبر نہیں ہے کہ دوسری قومیں تو اجنبی اور غیر ممالک میں بھی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں، اور آپ ہیں کہ خود اپنے وطن، بلکہ اپنے گھر کے اندر اور اپنے بال بچوں کے سامنے جانوروں سے زیادہ حقیر و ذلیل ہیں؟

کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو شرم نہیں آتی۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ کی خودداری کا معیار عبرتناک حد تک پست ہے؟

اور کیا یہ خبر صحیح دی گئی ہے کہ آپ ع در با و رد بسا زد ہیچ در با مطلب، پر عمل پیرا ہو کر، ان تمام تذلیلوں اور توہینوں سے مصالحت فرما چکے ہیں؟ خیر یہ صحیح ہو یا غلط ——— میں ایک مدت سے سنتا چلا آ رہا ہوں کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر، انتہا درجے کے حساس، خوددار، اور غیور ہوا کرتے ہیں۔ اگر میرے ہندوستان میں بھی یہی ہے تو میں اپنے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے دو زانو ہو کر گڑگڑاؤں گا کہ خدارا اپنے ادب میں عظیم انقلاب پیدا کر کے ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو خونی گرداب کے خوں آشام دانتوں سے چھڑا لیجئے، جلد چھڑا لیجئے۔ ورنہ کشتی ڈوب جائے گی۔ اور شباب و محبت کا

واسطہ اپنے ادبیات میں حیات وبیداری کا خون دوڑائیے، اور وطن عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند تیار کیجئے، جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی جلوس، فوج در فوج، اور قطار اندر قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں

یاد رکھئے ایک صحیح جنبشِ قلم، ستر ہزار برہنہ تلواروں کے مقابلہ میں زیادہ کارآمد آلۂ جنگ ہے۔

میں آخری بار پھر یہی کہوں گا کہ جو کچھ کہنا ہے جلدی کہئے۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کیجئے ورنہ :-

کی گئی ناوقت قربانی تو پھر کیا فائدہ؟
سر سے اونچا ہو گیا پانی تو پھر کیا فائدہ؟

غزل گوئی

میں آج ایک ایسا مسئلہ چھیڑ رہا ہوں، جس کی مخالفت تو ہوگی ہر طرف سے اور موافقت میں بمشکل دو چار سے زیادہ آوازیں بلند نہ ہوسکیں گی۔

کسی کلیۂ قدیم اور رواج محکم کا توڑنا بچوں کا کھیل نہیں، اس کے لئے کافی جرأت اور طعن و تشنیع برداشت کرنے کی پوری قوت درکار ہے۔ جرأت تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اردو کی محبوب ترین چیز، یعنی غزل کے خلاف مضمون لکھ رہا ہوں، رہی طعن و تشنیع سننے کی قوت، سو اس کا بھی انشاء اللہ جلد اندازہ ہو جائیگا۔

میں یہ سوال اٹھانا چاہتا ہوں۔

(۱) کیا غزل "مصنوعی" اور جھوٹی شاعری کا آلۂ کار نہیں؟

(۲) کیا غزل گویوں کو صحیح معنی میں شاعر کہا جا سکتا ہے؟

ظاہر ہے اس سوال کا جواب دینے کی خاطر، پہلے ہمیں یہ طے کرنا پڑے گا کہ

(۱) شاعری کیا ہے؟

(۲) شاعر کسے کہتے ہیں؟

(۱) شاعری کیا ہے؟

یہ مسئلہ اس قدر طویل اور پیچیدہ ہے کہ دفتر کے دفتر سیاہ کرنے کے بعد بھی

تسلی دشوار ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن موضوع کی وسعت و نزاکت کے باعث کوئی ایک ایسی تعریف، جس پر کسی زمانے میں بھی اجتماع ہو سکا ہو، اب تک معرض وجود میں نہیں آئی ہے۔

میں اس مقالے میں طوالت سے گریز کرکے مختصر راستہ اختیار کرنے ہی پر قناعت کروں گا۔ اس لئے اور بھی طوالت کو فضول سمجھتا ہوں کہ ظاہر ہے اس مقالے کو وہی حضرات دلچسپی سے پڑھیں گے۔ جن کا ادبی ذوق اچھی طرح ترقی یافتہ ہوگا اور یقین ہے کہ ان کے واسطے اشارات کے ذریعے سے عبارات کے تمام محذوفات و مقدورات تک پہنچ جانا دشوار نہ ہوگا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں آئے دن انسانی قلب پر جو اثرات پڑا کرتے ہیں۔ وہ شعوری و غیر شعوری طور پر نوع انسانی کے افعال، افکار اور اقوال کو مختلف سانچوں میں ڈھالا کرتے ہیں۔ لیکن جب شاعر کے قلب پر یہی اثرات پڑتے ہیں تو ان کی کیفیت و شدت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ توپوں اور بادلوں کے گرجنے سے غیر شاعر پر وہ اثر نہیں پڑتا جو عینک کے تال پر ایک ذرے کے گرنے سے شاعر کے دل پر ہوتا ہے۔ ہر وہ جذبہ خواہ دیکھنے میں کتنا ہی حقیر ہو جو شاعر کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور ہر وہ اثر جو شاعر کے قلب پر پڑتا ہے وہ اس کے دل و دماغ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جنبش کرنے لگتا اور اس کے خون میں شامل ہو کر اس کے ہر بن مو میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے مشتعل سینے میں اس وقت تک برابر تڑپتا اور مچلتا رہتا ہے۔ جب تک کہ اپنے بہ احسن الوجوہ اظہار کے لئے مناسب الفاظ اور موزوں بحر انتخاب نہیں کر لیتا اور مناسب الفاظ اور موزوں بحر، جیسے ہی

اس کی گرفت میں آجاتی ہے وہ شعر بن کر شاعر کے قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔

میرا مدعا یہ ہے کہ شاعر جو کچھ دیکھتا اور سنتا سونگھتا چھوتا اور چکھتا ہے۔ جو کچھ اس پر گزرتی یا وہ دوسروں پر گزرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ نیز جو کچھ بھی سوچتا، سمجھتا اور غور کرتا ہے، یہ تمام چیزیں اس کے دل و دماغ میں کروٹیں لیتی رہتی ہیں اور جلد یا بدیر پختہ و رسیدہ ہو کر، شعر کا لباس اختیار کر لیتی ہیں۔ کبھی تو یہ عمل بجلی کی سرعت کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔ اور کبھی دیر لگ جاتی ہے۔ لیکن .... ناممکن ہے کہ شاعر پر کوئی، اثر پڑے اور وہ ،، شعر بننے کے عوض خود اسی کے دماغ میں کھپ کر رہ جائے اور اپنے پالنے ہی میں گھٹ کر مر جائے۔

شاعری جہاں آپ بیتی ہے۔ وہاں جگ بیتی بھی ہے۔ شاعری اگر داخلی ہے تو خارجی بھی ہے۔ اس لئے اگر ہم شاعری کو حیات کی مصوری، اور زمانے کی تاریخ نویسی کا لقب دیں تو دراصل یہ حقیقت سے بعید نہ ہوگا۔

اس بات کو ذہن میں رکھئے گا کہ میں نے شاعری کو "حیات کی مصوری" اور "زمانے کی تاریخ نویسی"، کہا ہے۔

(۲) شاعر کسے کہتے ہیں؟

ہر چند یہ سوال پہلے سوال کے مقابلے میں آسان ہے لیکن اس کے متعلق بھی ارباب فن میں اختلاف آرا کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔

میں تو بہر حال مختصر ترین طور پر یہ عرض کروں گا کہ میرے نزدیک شاعر ہے وہ شخص، جو سب سے زیادہ حساس ہو۔ اُس کے جذبات شدت کے ساتھ سریع الاشتعال ہوں اور وہ اپنے احساسات اور جذبات کو بہترین الفاظ میں ادا کر دینے کی قوت بھی

رکھتا ہو۔

یہ تو شاعری کی عمومی اور مختصر تعریف ہوئی۔ میں تشریح کی خاطر شاعر کی چند خصوصیتیں بھی عرض کر دوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

شاعر کی طبیعت یہ ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرّے، حیات کے ہر تیور، حواس وماورائے حواس کے ہر پہلو، احساسات کے ہر رُخ اور جذبات کی ہر ادا کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس سے متاثر ہوتا ہے اور ان تاثرات کو موزوں ترین جامۂ الفاظ پہنانے کی صلاحیت وقدرت بھی رکھتا ہے۔

اِس کے علاوہ شاعر کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی ایک موضوع، کسی ایک مقصد، کسی ایک تعلیم، کسی ایک فلسفے اور حیات کے کسی ایک رُخ کے اندر قید ہو کر نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ تو قرآن کی زبان میں ہر آن نئی نئی وادیوں کی سیر کیا کرتا ہے۔ وہ تو ہواؤں کی طرح آوارہ۔ ابر کی طرح بے پروا خرام۔ تصورات کی طرح بے قید وبند اور ایتھر کی طرح آزاد ہوتا ہے۔

وہ کہیں ٹھہر بھی کیوں کر سکتا ہے، اس کے کانوں میں تو ہر آن "جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محمل ہا" کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ اس کے سپرد تو اتنے ناقابلِ شمار فرائض ہوتے ہیں کہ وہ کسی ایک منزل میں ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ حالانکہ ہر منزل اس کی ہے اس کا کام تو آفتاب کی طرح ہر پست وبلند پر چمکنا اور ہواؤں کی طرح ہر خار وگل کا منہ چومنا ہے۔ وہ تو اپنے مشاغل کی فراوانی کے باعث گھبرایا گھبرایا سا رہتا ہے۔ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کس فریضے کو انجام دے اور کسے ملتوی کر دے۔ اسے تو ہر چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ دردناک لہجے میں آواز دیتا ہے

کہ اے شاعر، مجھے بھی شعر بناتا جا، وہ تو زمین و آسماں کی طرف دیکھ کر، ہر بُنِ موئے مرا با تو ہزاروں کار راست، کی آواز بلند کرتا رہتا ہے اور پھر قدرت کی طرف اشارہ کرکے چیخ اُٹھتا ہے :-

در ہیچ مقامم نہ گذارد بدر رنگے
از بوئے ببوئے برد از رنگ برنگے

اس کے علاوہ عرض کیا جا چکا ہے اور اس کے یاد رکھنے کی استدعا بھی کی جا چکی ہے کہ "شاعری حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نویسی" کا نام ہے اِس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر کا ہر شعر اس کی سیاحتِ حیات کا اندازہ لگانے والوں کے لئے ایک قدم" ہوا کرتا ہے۔ شاعر کے کلام سے آپ اس کے مزاج کی افتاد، اس کے احباب اور خاندان کا معیار، اس کی زندگی کے مختلف واقعات معلوم کرسکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اس کا کلام اس کی ایک نوع کی بیاگرانی۔ (سوانح عمری) ہوتا ہے۔ اور صرف یہیں تک نہیں۔ آپ کو اس کے کلام سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے زمانے کی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا۔ اس کے دور میں عام پبلک خیالات کی نوعیت کیا تھی، اس وقت کے معاشری، تمدنی مذہبی اور سیاسی اشعار کیا تھے اور اس کے ہم عصروں کی ذہنیتوں کا رُخ بالعموم کس طرف تھا۔

اگر "شاعری" اور شعر کی یہ مختصر تعریفیں جو میں نے مجملاً پیش کی ہیں۔ درست ہیں تو آیئے اس روشنی میں اپنی "غزل" اور اپنے "غزل گویوں" پر نگاہ ڈالیں۔

ہماری غزل

شاعری کے باب میں عرض کر چکا ہوں کہ قلب پر جو اثرات پڑا کرتے ہیں وہ

اپنے اظہار کے لئے موزوں بحر اور مناسب الفاظ تلاش کر کے شاعر کے قلم سے شعر بنکر ٹپک پڑتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہماری غزل اسی فطری سلسلۂ عمل کا نتیجہ ہوتی ہے؟ یعنی کیا پہلے غزل گو حضرات پر کسی نوع کا کوئی اثر پڑتا ہے۔ اس اثر سے ان کے جذبات میں ہیجان آجاتا ہے اور اس کے بعد وہ اثر ان کے سینے میں اسوقت تک تڑپتا رہتا ہے۔ جب تک اپنے اظہار کی خاطر موزوں بحر و مناسب الفاظ تلاش کر کے شعر کی صورت اختیار نہیں کر لیتا، اگر ایسا نہیں ہے تو کیا سب سے پہلے ان کے پیش نظر چند روایات اور چند الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جسے موزوں کر دینے کی خاطر وہ بعد کو اثر پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور آیا حقیقی اور سچّی شاعری کی تعریف میں پہلی صورت درست ہے یا دوسری؟

اس کی تحقیقات کا سب سے آسان ذریعہ یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ آیا غزل کس طور سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ غزل بالعموم مصرع طرح پر کہی جاتی ہے۔ اگر مصرع طرح ہے۔

"اقرار کر لیا کبھی انکار کر دیا"

تو ہمارے غزل گو کیا کریں گے؟ بیمار، رفتار، گفتار، تلوار، اغیار یہ تمام قوافی لکھ کر سامنے رکھ لیں گے، یا جو مشاق ہیں وہ اِن تمام قوافی کو ایک خاص حصہ دماغ میں جمع کر لیں گے یا انتہائے مشق کے باعث یہ تمام قوافی خود بخود ان کے دماغ میں یکے بعد دیگرے آتے جائیں گے۔ اور اس کے بعد انتہائی کدوکاوش اور وقت نظر کے ساتھ ہمارے "شعراء" غور فرمانے لگیں گے کہ "اقرار" پر کیا کہا جائے "انکار" کو کس طرح نباہیں اور اغیار کو کیونکر باندھا جائے۔ اس کے بعد دوسری منزل آئے گی، "اقرار" "انکار"

اور "اغیار" کے بندھے گھڑے، یا کہے ہوئے مصرعوں پر مصرع لگانے کی، اور بسا اوقات یہ ہوگا کہ پہلا مصرع دس دس بار کاٹنے پر بھی حسب مردانہ لگ سکے گا۔

یہ ہے وہ سلسلۂ عمل، جس سے غزل "طیار" کی جاتی ہے۔ میں دریافت کرتا ہوں کیا یہ سلسلۂ عمل حقیقی اور فطری ہے؟ یہ جذبات اور تاثرات کی سحر کاریاں ہیں؟ یا الفاظ کی بازی گریاں؟ کیا ایسے اشعار کو جنہیں محض چند الفاظ کی خاطر جذبات نے نہیں،۔۔۔ مشاقی و موزونیٔ طبع نے پیدا کیا ہو الہامی اور حقیقی شعر کہا جا سکتا ہے؟

کیا یہ ناقابلِ انکار حد تک واقعہ نہیں ہے کہ ہمارے غزل گو حضرات تمام انسانی جذبوں کی گرفت سے بالاتر رہتے ہوئے محض الفاظ کو ٹٹولا نہیں کرتے اور محض چند قوافی کو "باندھ" کر شاعری کو رسوا نہیں کیا کرتے ہیں؟ اور کیا یہ حقیقت اور ثابت شدہ امر نہیں کہ "ہمارے شعراء" الفاظ کے ذریعے سے اپنے اوپر وہ اثر یا کیفیت، طاری کرنے کی ناکام، غیر فطری اور قابلِ مضحکہ سعی نہیں کرتے جو حقیقی شعراء پر خاص حالت کے ماتحت قدرت طاری کیا کرتی ہے؟ اور کیا یہ سعی بالکل ایسی نہیں ہے کہ جب قطعی طور پر ہنسی نہ آرہی ہو۔ وہ بہ تکلف اور زور لگا کر ہنسنے کی کوشش کرے یا ہنسی کا منہ بنائے "جذبے کے ذریعہ سے الفاظ کا سیدھا اور فطری راستہ چھوڑ کر ہمارے غزل گویوں نے الفاظ کے ذریعے سے جذبے" کا غلط اور غیر فطری، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کیوں اختیار فرمایا ہے؟

کیا طرح بالکل ایسی صورت حال نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی عورت کو راستے سے پکڑ کر ہمارے سامنے لے آئے اور کہے اس پر عاشق ہو جائیے۔ کیا ہم واقعی عاشق ہو جائیں گے۔ کیا عشق فرمائشی چیز ہو سکتا ہے، کیا انسان فرمائشی عاشق بن سکتا

ہے اور کیا اس کے تصاف وصریح معنی نہیں کہ ہم سے مسخراپن کیا جا رہا ہے؟

فرض کیجئے دوست کی خاطر ہم ایسی لائی ہوئی عورت سے اظہارِ عشق بھی کرنے لگیں۔ لیکن کیا وہ اظہار، ہر جہت وہر حیثیت سے فرضی ومصنوعی نہ ہوگا؟

اب رہیں طبع زاد غزلیں، سو اُن کی شان میں بھی کچھ سُن لیجئے۔

غزلوں کی نوعیت کے باب میں خواہ وہ طرحی ہوں یا طبع زاد، حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھئے گا کہ ان کا ہر شعر علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک کو دوسرے شعر سے قطعی کسی قسم کی معنوی یا لفظی مناسبت نہیں ہوا کرتی۔

مطلع میں اگر ہجر پر نالہ وشیون ہے تو عین مطلع کے بعد، وصل پر اظہار شادمانی وکامرانی ہے۔ اس کے بعد کوئی تصوف کا مسئلہ آجاتا ہے۔ پھر معشوق کی شقاوتِ قلب کا رونا رویا جاتا ہے۔ اس کے بعد فوراً زاہدوں سے ہاتا پائی ہونے لگتی ہے کہ یکایک رقیب روسیاہ ظاہر ہوتا ہے اور شاعر صاحب کو دھکے دے کر بزم جاناں سے نکال دیتا ہے اور فوراً ہی اس کے بعد شاعر صاحب اپنے آباد اجداد کی سو پشت کی مانی ہوئی، سپہ گری کی قصیدہ خوانی شروع فرما دیتے ہیں —— یہی ہے نہ غزل یا کچھ اور۔

اب ملاحظہ فرمائیے۔ بات تو نفسیات ہی کی ہے مگر اس قدر سادہ اور عام فہم کہ ہر شخص اتنا بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ کم سے کم نوعِ انسانی پر تو وقتِ واحد میں جذبہ واحد ہی طاری ہو سکتا ہے۔ ایسا تو ازل سے اس لمحے تک کبھی ہوا ہی نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے کہ ہم ایک ہی لمحے میں مغموم بھی ہوں اور مسرور بھی —— ایک ہی لمحے میں رو بھی رہے ہوں اور ہنستے بھی جاتے ہوں۔

اور جب یہ شکل قطعی طور پر ناممکن ہے تو خدارا بتائیے کہ پھر غزل میں اتنے

جذبے کہاں سے آ کر جمع ہو جاتے ہیں اور ہمارے "شعراء" پر اس قدر مختلف کیفیتیں ایک ہی وقت میں کیوں کر طاری ہو جاتی ہیں؟ کیا غزل کہتے وقت دنیا بھر کے تمام مختلف النوع اور متضاد جذبے اور اثرات ہمارے "شعراء" کے دل و دماغ کو بار مونیم نواز کی انگلیوں کی طرح چھونے لگتے ہیں۔

کیا اب بھی یہ ثابت کرنے میں کسر باقی رہ گئی ہے کہ ہماری طرحی اور طبعزاد دونوں قسم کی غزلیں جذبے اور تاثر کے تحت نہیں۔ بلکہ محض الفاظ کی خاطر کہی جاتی ہیں؟

اگر کوئی غزل کسی خاص جذبے اور کسی خاص اثر کے تحت کہی جائے تو وہ لازماً شروع سے آخر تک ایک، اور صرف ایک ہی جذبہ و اثر کی حامل ہو گی۔ اس میں کسی دوسرے جذبہ و اثر کی گنجائش کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری غزلیں تو محض الفاظ کی بازی گری، اور شاعری کی نقالی کے نمونے ہیں ان کو شعر و شاعری سمجھنا، اپنی سخن سنجی کو رسوا کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

اس کے علاوہ غزل کے دو بڑے عیب اور بھی ہیں۔ غزل بالعموم محفلوں میں ساز پر گائی جاتی ہے۔ فرض کیجئے کسی محفل میں رندانِ خوش دل کا اجتماع ہے۔ اندھیری رات ہے۔ اور جھما جھم پانی برس رہا ہے۔ اس وقت ہر طبیعت چاہتی ہے کہ کوئی ایسی چیز گائی جائے جو خالص نشاطی اور ولولہ انگیز ہو، یا کسی محفل میں ہجر کے مارے ہوئے چند احباب جمع ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کوئی ایسی چیز گائی جائے، جس سے انھیں تسلی ہو۔ انھیں ٹھمریوں اور دادروں میں ایسی بے شمار چیزیں مِل جائیں گی۔ لیکن نہیں ملے گی تو ہماری غزلوں میں کوئی چیز جو ان کے جذبات کو آسودہ کرے۔ یہاں تو ہر غزل ایک ایسا چوں چوں کا مربہ ہے جس میں کسی جذبے کا پتہ ہی

نہیں چلتا۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ تندرست ذہنیت کے سامع کو جو شروع سے آخر تک ایک خاص جذبے کا ایک مکمل مطالعہ چاہتا ہے، غزل ایک شدید انتشارِ طبع میں مبتلا کر دیتا ہے۔

غزل کے اشعار دراصل ٹھوکریں ہوتے ہیں اور سامع کا دماغ فٹ بال، اسی کی دوش بدوش یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ غزل یا غزل کے مماثل کوئی صنف دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ تمام دنیا کی زبانوں میں مسلسل نظموں کے علاوہ غزل کا کہیں نام تک نہیں ہے۔ اور اس نقطۂ نظر سے کیا یہ مان لیا جائے کہ فارسی کے علاوہ اردو جس کی بچی ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں آج تک کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ہے؟ کیا آپ اس کے ماننے پر طیار رہیں۔؟

بعض حضرات گھبرا کر انگریزی کے "سانٹ" پیش کر دیا کرتے ہیں۔ اور گھبراہٹ ہی ٹھہری۔ انھیں یہ خیال نہیں رہتا کہ سانٹ بھی ایک اور صرف ایک خیال کی ترجمانی کرتے ہیں۔

بعض احباب فرماتے ہیں کہ ہم ایک نشست میں کب غزل کہتے ہیں۔ کم سے کم دو چار نشستوں میں غزل پوری ہوتی ہے اور اس لئے اس کے اشعار میں اختلاف دتضاد ہوتا ہے۔

اول تو مشاق شعرا کے وہاں یہ ہوتا ہی نہیں، وہ اکثر و بیشتر ایک ہی سانس میں ایک نہیں دو دو تین تین "طیار" کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے تو کم سے کم ہر نشست کے شعر تو ایک ہی رنگ کے ہونا چاہئیں جن سے پتہ چل جائے کہ اول

نشست میں شاعر کے دل و دماغ کی یہ کیفیت تھی اور دوسری نشست میں وہ ان جذبات کا حامل تھا۔ لیکن افسوس کہ ایسا بھی نہیں ہوتا۔ ہر شعر دوسرے سے جدا ہوتا ہے اور ”ہر نفس کہ فرو می رود ممدِ حیات است، و چوں بر می آید مفرحِ ذات“ کے مانند اپنے اپنے ترانے الگ الاپتا ہے۔

بعض متغزلین کا یہ ارشاد ہے کہ ہم جذبات اور تاثرات سے خالی ہوکر کبھی شعر نہیں کہتے۔ ہماری زندگی کے تاثرات و تجربات کو تو قوافی جگا دیا کرتے ہیں! ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر اتفاق سے ”بیمار“ کا قافیہ ہمارے پیش نظر ہے تو ہمیں کوئی اپنی بیماری یاد آجاتی ہے اور اگر سرشار کا قافیہ سامنے ہے تو ہمیں اپنی یا کسی دوسرے کی سرشاری یاد آجاتی ہے اور اس طرح حافظے کے بیدار ہوتے ہی ہمارے تاثرات اور جذبات بھی بیدار ہو جاتے ہیں اور اس کیفیت میں ہم جو شعر بھی کہتے ہیں وہ فطری ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کے ذریعے سے بیتے ہوئے اور خوابیدہ واقعات کے اتفاقیہ طور پر جاگ اٹھنے کی کیفیت اس قدر ”پھُس پھُسی“ اور ناقابل اعتبار ہے کہ اس پر غور بھی نہ کرنا چاہیئے الفاظ کے ذریعے سے معانی اور حافظے کی وساطت سے جذبات تک رسائی خواہ کچھ بھی ہو، الہامی اور حقیقی شاعری تو ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تو بالکل ایسی چیز ہے جیسے مشین کے ذریعے سے انڈوں سے بچے نکالے جاتے ہیں۔

بعض حامیان غزل یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہم وسیع خیالات کو دبا اور بھینچ کر صرف دو مصرعوں میں ادا کر لیتے ہیں۔ کیا یہ کمال نہیں؟ میں بھی اس کمال کا اسی طرح قائل ہوں جیسے سرکسوں کے مختلف کرتبوں کا۔ لیکن اگر وہ مجھ سے یہ مطالبہ بھی کریں کہ میں اس ”کمال“ کو ”شعر“ بھی تسلیم کر لوں تو کم سے کم میں تو اس پر ایک لمحے کے واسطے بھی

بھی طیار نہیں ہو سکتا۔

یہاں تک تو غزل کا مسئلہ تھا۔ اب آئیے ذرا غزل گویوں کا بھی جائزہ لے لیں۔ عرض کر چکا ہوں کہ شاعر سب سے زیادہ حساس اور سریع الاشتعال جذبات کا حامل ہوتا ہے، وہ آفتاب کی طرح اس کرۂ ارض کے ذرے ذرے سے تعلق رکھتا ہے وہ حیات کے کسی ایک خاص پہلو، اور کائنات کے کسی ایک خاص شعبے کا صیدِ زبوں ہو کر نہیں رہ جاتا اور اس کے کلام سے اس کے سوانح، اور اس کے عہد کے حالات مرتب و مدون ہو سکتے ہیں۔

اس تعریف کی روشنی میں ذرا اپنے "شعراء" کے خال و خط ملاحظہ فرمائیے تعریف کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھیے اور دیکھیے آپ کے "شعراء" کہاں تک "شاعر" کے پیمبرانہ خطاب کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

قطب شاہیوں کے دور سے لے کر اس عہد تک کے شعراء کا کلام پڑھیے کیا وہی ایک حسن و عشق کا موضوع ہر جگہ نہیں پایا جاتا؟ شاعر اور صرف ایک موضوع کتنی حیرتناک بات ہے!

یہ سچ ہے کہ شاعری میں سب سے زیادہ دل کش موضوع حسن و عشق ہی ہے۔ لیکن شاعر کے لئے کیا یہ ممکن ہے کہ زندگی بھر ایک ہی موضوع سے وابستہ رہے۔ اُسے اس پورے کرۂ ارض کی کوئی دوسری شے تمام عمر متاثر ہی نہ کر سکے کیا ہمارے "شعرائے کرام" کی زندگیوں میں کبھی مست گھٹائیں جھوم کر نہ آئی تھیں۔ کبھی پپیہا نہیں کوکتا تھا، کبھی چاندنی کھیت نہیں کرتی تھی۔ کبھی برستی اور جھومتی ہوئی راتیں بال نہیں بکھراتی تھیں۔ کبھی پیچ و خم کھاتے ہوئے دریا ان کے سامنے نہیں

لہراتے تھے اور کبھی افق کا دریچہ کھول کر دوشیزہ سحر ان کے روبرو نہیں مسکراتی تھی۔

اس کے علاوہ کیا ان کی معاشرت و سیاست میں کبھی کوئی قابلِ ذکر انقلاب نہیں ہوا تھا۔ کبھی اُن کی قوم پر کوئی دل ہلا دینے والی مصیبت نہیں آئی تھی۔ کبھی ان کا کوئی دوست نہیں بچھڑ گیا تھا۔ کبھی کسی نے ان پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ کبھی انھوں نے کسی یتیم کا اترا ہوا منہ اور کسی نوجوان بیوہ کی الجھی ہوئی کاکلیں نہیں دیکھی تھیں؟ اور کیا کبھی انھوں نے کسی ظالم و غاصب کو خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے نہیں دیکھا تھا؟

اور اگر انھوں نے یہ تمام مناظر و واقعات دیکھے تھے اور ضرور دیکھے تھے تو مروت و رعایت اور بزرگ پرستی کو بالائے طاق رکھ کر جواب دیجیے کہ کیا اس گروہ کو حساس ترین گروہ کہہ سکتے ہیں اور کیا یہ شعرار سریع الاشتعال جذبات کے حامل کہے جا سکتے ہیں؟

حساس ہونا تو بڑی چیز ہے میں تو یہ پوچھوں گا کہ وجہ بتائیے۔ میں انہیں قطعی طور پر بے حس، اور سُن کیوں نہ تسلیم کروں؟ یہ سوال کروں گا کہ اس بے پایاں حد تک بے حس اور سُن اشخاص کیا ,,شاعر،، کے لقب سے پکارے جا سکتے ہیں؟ کیا ,,شعرار،، ایسے ہی ہوتے ہیں؟ اور کیا شاعر، اس پورے کرۂ ارض اور اس عظیم الشان حیات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے زندہ بھی رہ سکتا ہے؟

اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب آپ اس قدر سختی نہ کریں یہ تو مغلوب الحال عشاق تھے۔ انھیں اپنے عشق اور معشوق سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ دنیا کی کسی اور شے کو دیکھ سکتے۔

اس کا ایک جواب تو بہت ہی طوالت آمیز نفسیاتی بحث چاہتا ہے یعنی اس نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جائے کہ عشاق کی ذہنیت کیا ہو جاتی ہے اور کیا اس ذہنیت کے پیدا ہو جانے سے ان میں اپنی قوم کی محبت، یا کسی یتیم پر ترس کھانے، یا کسی بیوہ پر رحم کرنے کا مادہ باقی رہ جاتا ہے کہ نہیں؟ اور عشاق پر آیا موسموں کے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں یا وہ "موسم پروف" ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن طوالت کے خیال سے میں سر دست اس بحث میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔

میں تو اس بات کا کہ یہ حضرات عشاق تھے اور اس وجہ سے دنیا کی کسی اور شے کو دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ سیدھا سا جواب دوں گا کہ آیئے اُن کے کلام پر نگاہ ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ یہ صحیح معنی میں عشاق بھی تھے۔ کہ نہیں۔

میں نے تو جہاں تک ان "شعراء" کا کلام پڑھا ہے، روائتی اور موروثی عشق کی بکواس کے علاوہ حقیقی اور عملی عشق کا تو مجھے کم سے کم ایک بار بھی پتہ نہیں چلا۔ واضح ہو کہ حقیقی اور عملی عشق کے تیور ہی کچھ اور ہوا کرتے ہیں، اگر یہ حضرات واقعی جیتے جاگتے معشوقوں کے عاشق ہوتے تو لاکھوں اور ہزاروں میں کم از کم دو چار معشوق تو ایسے بھی نکل آتے جو ان کے عشق کو قبول کر لیتے، ان سے بھی محبت کرتے اور ان کے عشق میں بھی آہیں بھرتے۔ لیکن ایک ایک کر کے ان شعراء کے تمام ردیف دار "کلیات"، "دواوین" دیکھ جائیے۔ ہر جگہ آپ کو معشوق بے وفا، قاتل، خونی، اغیار پسند، رقیب نواز اور عاشق کش ہی ملے گا۔

آخر یہ کیا بات ہے؟ کیا ہمارے شعرائے کرام بغیر استثناء سب کے سب اس درجہ مکروہ صورت واقع ہوئے تھے کہ آج تک ان پر کسی معشوق کا دل آیا ہی نہیں؟ اور

اس کے ساتھ اس پر بھی غور کیجیے کہ اگر یہ عملاً عشق پیشہ حضرات تھے تو کسی ایک
خدا کے بندے کو تو اتنی توفیق ہوتی کہ وہ رقیب روسیاہ پر غالب آجاتا!
آخر یہ کیا معمہ ہے؟ گویا ہمارے "شعرائے کرام" بغیر استثنا سب کے سب
اتنے بزدل تھے کہ آج تک رقیبوں سے جیت ہی نہ سکے؟
آخر میں یہ عرض کروں گا کہ اگر یہ حضرات واقعی شاعر و عاشق تھے تو ان کے
کلام میں انفرادیت کیوں جھلکتی نظر آتی ہے؟
یہ سب کے سب تو ایک ہی طرح کی باتیں کر رہے ہیں، کیا ان کی شاعری
پولیس کے سکھائے ہوئے گواہوں کے بیانات کی طرح ایک دوسرے سے
ملتی جلتی ہوئی نہیں ہے؟
اُردو شاعری کے آغاز سے اس وقت تک ہندوستانی زندگی میں کتنے سیاسی
و معاشرتی انقلابات ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے دواوین میں ان کا پتہ تک
نہیں چلتا۔
کیا ان کی شاعری حیات کی مصوری اور "زمانے کی تاریخ نگاہی" کہی جا سکتی
ہے؟ کیا ان "شعرا" کو ہم "مصورِ حیات" اور "مورخ عصر" کا خطاب دے سکتے ہیں؟
یہ چیزیں تو بہت بڑی ہیں، ان غریبوں کے "کلامِ موزوں" سے تو پتہ تک
نہیں چلتا۔ کہ یہ کس عہد میں پیدا ہوا، اور وہ کس زمانے میں مرا تھا، ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ یہ تمام شعرا ایک ہی زمانے میں موجود تھے۔ ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔
ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ ایک ہی غسل خانے میں نہاتے اور ایک ہی دستر
خوان پر کھانا کھاتے تھے۔ ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی لانبے سے تکیے پر

سب کے سب سرِ رکھ کر سوتے تھے اور ایک ہی دن سب بیدار ہوئے تھے اور ایک ہی دن سب کے سب مر گئے تھے یہ ہیں ہمارے "مصورانِ حیات"، یہ ہیں ہمارے "مورخانِ عصر" یعنی ہمارے شعرائے جلیل و کبیر!!!

آہ کس سے یہ حقیقت بیان کی جائے اور اس دورِ خام و خامِ نوازی میں کون اس پر یقین لا سکے گا کہ ہر شاعر، موزوں طبع ہوتا ہے لیکن ہر موزوں طبع، شاعر نہیں ہوتا، کیا میری قوم ایک لمحے کے لئے غور کرے گی کہ غزل کو باقی رکھنے میں کتنا ادبی نقصان اور کس قدر سیاسی خطرہ ہے؟

بدحواسیاں

"کلیم" میں اشاعت کے واسطے مرحمت فرمادیا کریں۔

میری قوم ناقابل برداشت حد تک سنجیدہ ہو چکی ہے، حالانکہ کل کی بات ہے کہ ہماری زندہ دلی اور ہماری رنگینیاں ضرب المثل تھیں۔ آج پھیپھڑے کی پوری قوت کے ساتھ قہقہہ مارنا مرتبے سے گری ہوئی بات سمجھا جاتا ہے۔ کل تک ہماری ہولیوں کی پچکاریاں روئے زمین کو رنگین کر دیا کرتی تھیں، آج اگر کہیں رنگینی ہے تو صرف ہماری خونچکاں آنکھوں میں۔

اے میرے ہندوستان تیری زندہ دلیوں اور رنگینیوں کو کس کی نظر کھا گئی۔ ہنس اے دکھیا ہندوستان ہنس، پروا نہ کر مصائب و آلام کی، تو نے سنا ہے؟

ع۔ غم، موج تبسم سے ترش جاتا ہے

میں اپنے غمگین بھائیوں کو ہنسانا چاہتا ہوں، خواہ وہ مجھی پر کیوں نہ ہنسیں لیکن ہنسیں تو۔ اُن کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر میرے دل سے خون کی بوندیں

ٹپکنے لگتی ہیں۔

میں اپنی قوم کو ہنساؤں گا، ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ ہاں تو سنئے میری بدحواسیاں — لیکن آپ بھی اپنی بدحواسیاں بیان کیجئے گا، یہ نہ ہو کہ آپ تو مجھ پر ہنس لیں، اور میں آپ پر ہنس نہ سکوں۔

میری بدحواسیاں

(۱) صبح کا وقت تھا۔ میں اپنے والد گرامی کے نہایت قابلِ قدر دوست، عم محترم جناب منشی التفات رسول صاحب مرحوم تعلقدار سندیلہ کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کی غرض سے سندیلے گیا ہوا تھا۔ ایک روز غالباً صبح کے وقت، جی بہلانے کی خاطر اسٹیشن پر ٹہل رہا تھا، کہ اتنے میں گاڑی آئی، اور پلیٹ فارم پر آکر رک گئی میں گاڑی کی سیر کرنے لگا۔ دیکھتا ہوں کہ ایک فرسٹ کلاس میں میرے ایک نہایت محبوب دوست بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں ہمہ تن اشتیاق بن کر اُن کی طرف بڑھا، وہ بھی کھڑکی کے پاس آکھڑے ہوگئے، ان کے چہرے سے بھی میری ملاقات کا کس قدر شوق ٹپک رہا تھا لیکن جیسے ہی کھڑکی میں سر ڈال کر میں نے ان سے ہاتھ ملانا چاہا، دفعتہً کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی، میرے ماتھے سے خون ٹپکنے لگا۔ اور وہ محبوب دوست یکایک غائب ہوگئے۔ آپ سمجھے وہ میرے دوست کون تھے؟ کھڑکی کے بند شیشے میں خود میرا ہی عکس پڑ رہا تھا!

(۲) ایک نوجوان دوست کے ساتھ حیدرآباد کے دلفریب باغِ عامہ میں ٹہل رہا تھا کہ سامنے سے موٹر میں ایک پیر مرد گزرتے نظر آئے۔ مجھ سے ان سے صاحب سلامت ہوئی۔ موٹر گزر گیا۔ اور میں نے اپنے دوست سے جو میرے ساتھ ٹہل رہے تھے، بڑے

دردناک انداز میں کہا "دیکھئے زندگی میں کیسے کیسے حمقاء سے صاحب سلامت کرنا پڑتی ہے"، اور یہ کہتے ہی میں نے دیکھا کہ یکایک اُن کا رنگ اُڑ گیا، اور یہ رنگ دیکھتے ہی مجھے فوراً یاد آ گیا کہ وہ تو ان کے باپ تھے۔

(۳) ایک صاحب دفتر میں بڑے ہی تپاک سے آ کر گلے ملے، اور مجھے میرے لڑکپن کے نام "تسبیر" سے مخاطب کیا۔ لیکن میں نے انہیں قطعی نہیں پہچانا۔ ہر چند اُن کی ہر بات کا انتہائی گرمجوشی اور بے تکلفی سے جواب دیتا رہا۔ لیکن دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ یہ ہیں کون — اتنے میں ایک سن رسیدہ اور ثقہ دوست تشریف لے آئے جو پرانی تہذیب کے حامل تھے، انھوں نے میرے ان دوست کے متعلق جنھیں میں پہچاننے کی انتہائی سعی کر رہا تھا، مجھ سے کہا:

"آپ کی تعریف"

اور خدا جانے یہ کیا معاملہ تھا کہ یکایک میرے منہ سے نکل گیا:۔

آپ کے شوہر!!!

(۴) میں اپنے ایک نہایت خاموش اور سنجیدہ دوست کے وہاں مہمان کے طور پر ٹھہرا ہوا تھا، جو ایک مشہور شاعر ہیں۔ رات کے وقت جب دسترخوان بچھا تو انھوں نے اپنی غزل سنانا شروع کی میں داد دیتا رہا۔ وہ شعر پڑھتے پڑھتے رک گئے اور کہنے لگے اب ایک شعر سناتا ہوں جو آپ کو بیحد پسند آئیگا۔ میں نے کہا "ارشاد" انھوں نے ایک نہایت معمولی سا شعر سنایا، اور میری زبان سے بیساختہ نکل گیا "کیا لغو شعر ہے"

میرے سنجیدہ دوست نے، جن سے مجھ سے کبھی ایک بار بھی مذاق نہیں ہوا

تھا، اپنی عینک کے تالوں سے مجھے انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا۔ اور میرے واسطے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ میں نے ان کے خدمتگار سے کہا۔ "رمضانی! تھوڑا سا پانی"!

(۵) ایک روز دفتر جانے میں ذرا دیر ہو گئی تھی، میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور پردا اٹھا کر باہر جانے لگا، کہ اتنے میں میری بیوی، اور ان کے ساتھ بچوں کے فلک شگاف قہقہوں کی آواز نے مجھے وہیں روک دیا۔ اور اب کیا دیکھتا ہوں کہ میں پائجامے کے علاوہ پورا لباس پہنے ہوئے ہوں!

(۶) ایک مرتبہ میرا موٹر بگڑ گیا تھا۔ تانگے پر آمدورفت رہتی تھی، کارخانے والوں کی بد عہدیوں کے باعث دو ماہ تک مجھے تانگوں ہی میں بیٹھنا پڑا۔
دو مہینے بعد خدا خدا کر کے موٹر واپس ہوا، اور اُسی روز شام کو میں اپنے دوست حضرت ذوقی کو لیکر سیر کرنے نکلا اور جیسے ہی تانگوں کے اڈے کے قریب پہونچا، موٹر روک کر ذوقی صاحب سے کہا، بھئی دیکھو یہ سامنے والا تانگا بہت اچھا ہے، اِسے لے لو ورنہ اِس سے بہتر تانگہ نہ مِل سکے گا۔

اور جب ذوقی صاحب نے زور سے قہقہہ مارا، اس وقت معلوم ہوا کہ میں تو موٹر میں بیٹھا ہوں!

---

(۷) موٹر کے دو واقعے اور بھی ہیں۔

رات کو ٹہلنے نکلا، دو ایک احباب بھی ساتھ تھے۔ اتنے میں چوراہے سے پولیس کی سیٹی کی آواز آئی، میں فوراً ہی ٹھہر گیا اور ایک دوست سے کہا ذرا دیکھیے شاید پیچھے کی لائٹ گل ہو گئی ہے!

(۸) ایک روز سویرے چہل قدمی کرتا ہوا ایک چوراہے پر آنکلا، سامنے پولیس کا آدمی کھڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میں ٹھہر گیا، اور سیدھے ہات سے سائڈ دینے لگا۔ وہ ہکا بکا ہوکر میرا منہ دیکھنے لگا، اور مجھے غصہ آنے لگا کہ یہ کمبخت میرے موٹر کو کیوں رو کے ہوئے ہے، اور سائڈ کیوں نہیں دیتا۔

اتنے میں نہایت خشونت کے ساتھ مینے اپنا ہات ہلانا شروع کر دیا، اور پولیس والا، مجھے اُس کی حیرت اور پریشانی اب تک یاد ہے، گھبرایا ہوا میری طرف آیا اور اپنی مخصوص زبان میں کہنے لگا "صاحب! کیا ہونا؟ بس یہ سنتے ہی میں نے دیکھا کہ میں تو سڑک پر کھڑا ہوا ہوں آخر میں اور اس قدر تیزی سے روانہ ہوا کہ جب میں نے موڑ سے پولیس والے کو مڑ کر دیکھا تو وہ مجھے ایسی حیرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا گویا میں قطعیٔ طور پر مجنوں ہوں۔

(۹) ایک روز اپنے ایک نہایت متین دوست کے وہاں اُن کی بیوی کی وفات پر تعزیت کی رسم ادا کرنے گیا۔ باتوں باتوں میں، تصاویر کا ذکر چھڑ گیا، اور وہ ایک البم مجھے دکھانے لگے۔ ناگاہ ایک ورق جو پلٹتے ہیں تو ایک عجیب صورت کی تصویر نظر پڑی، مینے بیساختہ پوچھا، "نواب صاحب یہ کون جانور ہے"؟

انھوں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ میرے والد ہیں!

خدا کے تین قہر

(۱) ہندوستانی ہونا۔

(۲) مسلمان ہونا۔

(۳) "یو۔پی" کا باشندہ ہونا۔

میں ان تینوں قہروں پر تین پھپھلتے ہوئے اشارہ کروں گا۔ قارئین اپنے تخیّل سے خانہ پُری فرمائیں۔

(الف) ہندوستانی ہونا:۔

جس نے بھی بدبخت ہندوستان کی عبرت انگیز تاریخ پڑھنے کی ایک مُدبّر کی طرح تکلیف اٹھائی ہے، وہ انتہائی قلق کے ساتھ یہ ہمت شکن فیصلہ کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ اس نامراد ملک کی آب و ہوا، حیات و کشمکشِ حیات کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

یعنی ہندوستان ایک ایسی مردانہ قوتوں کو نچوڑ لینے والی عورت ہے جو آئے دن نئے نئے شوہر تلاش کیا کرتی ہے، یہ ایک ایسی کلیوپٹرا ہے جس کی خواب گاہ تازہ بتازہ جوانیوں کی سانسوں سے مہکتی رہتی ہے۔

لیکن چند رنگین بہاروں کی معطّر چاندنی راتیں گزارنے کے بعد شوہر کو مڈیوں کا

مالا بناکر اور اس کا تمام رس چوس چوس کر گھر سے باہر نکال دیا کرتی ہے۔

غور کیجیے ہندوستان کے قدیم باشندے گونڈ اور بھیل کتنے قوی، کس قدر مضبوط اور کس قدر بلا کے طاقتور تھے۔ انھیں ہندوستان کے چٹیل میدانوں، اور ہولناک صحراؤں نے اپنے آغوش میں پالا تھا، وہ شدید موسموں کے چہیتے بیٹے تھے، اُن کی ہڈیوں میں شاندار و سربلند ہمالیہ کی چٹانیں صرف ہوئی تھیں، اور گوشت پوست کے اعصاب کی جگہ ان کی کھردری اور تابناک جلدوں کے نیچے تپائے ہوئے فولاد کے تار کھنچے ہوئے تھے۔

لیکن عروسِ ہند کا ذوقِ عیاشی دیکھیے کہ ان شیر افگن جوانمردوں کو مفتوح بنانے کی خاطر آوارہ گرد آریوں کا ایک مختصر سا تھکا ہوا گروہ یکایک ہندوستان میں وارد ہوتا ہے اور ان فرزندانِ تیر و کماں اور گُردانِ دیو پیکر کو ایک ادنیٰ سی جدوجہد کے بعد چوپاؤں کی طرح جنگلوں اور پہاڑوں میں ہانک کر اپنی بادشاہی کے ڈنکے بجانے لگتا ہے۔

آریوں کی حکومتیں ملک کے ہر گوشے میں قائم ہو جاتی ہیں۔

راجپوتوں کی برچھیاں، برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں پر چمکنے والی کرنوں کو شرمانے لگتی ہیں۔ اور ان کی جھلکتی ہوئی تلواروں کا پانی ہندوستان کی شاداب سرزمین پر گنگا جمنا بن کر بہنے لگتا ہے۔

لیکن عروسِ ہند کی دوسری کروٹ ملاحظہ فرمائیے کہ عین اسی عالم میں جب کہ راجپوتوں کی تلواروں کی جھنکار سے دشت و جبل گونجے ہوئے تھے۔ گرہیں لگی ہوئی باگوں اور پھٹی ہوئی زرہوں کے ساتھ مٹھی بھر مقدار آزما مسلمان اُن پر حملہ آور ہوتے ہیں، اور بیک گردشِ شمشیر ان ارجن اور بھیم کے وارثوں کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں

ڈال دیتے ہیں۔

اسلامی حکومت کا اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کی گونج میں اعلان کیا جاتا ہے۔ پتھروں کے سینے تراش کر ہیبت آفریں قلعے اور قصر تعمیر کئے جاتے ہیں۔ شوکت وصولت دربار میں حاضر ہو کر مجرا بجالاتی ہے۔ طبل وعلم آستانۂ شاہی پر سر جھکا دیتے ہیں۔ دبدبہ اور طنطنہ مورچھل لیکر پشت پر آکھڑا ہوتا ہے۔ ذرے ذرے پر سطوت اسلام کا آفتاب چمکنے لگتا ہے اور گنگا جمنا کے دھاروں پر کوثر تسنیم کی موجیں انگڑائیوں پر انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہیں۔

لیکن عروسِ ہند تجدید عشرت کے شوق میں پھریری لیتی ہے۔ جماہی لیکر، اور بکھری زلفوں کا جوڑا باندھ کر اپنی خوابگاہ کے زرّین دریچے کے شیشے سے پھر کسی اٹھلا اٹھلا کر چلنے والے رس بھرے نوجوان کا راستہ دیکھنے لگتی ہے کہ اتنے میں پھیکے رنگ روپ والے سوداگروں کا ایک مختصر سا قافلہ گربہ مسکین کی طرح پنجوں کو بند کئے ہوئے اس تیسرے کے گھڑے یعنی کشورِ ہندوستان میں داخل ہوتا ہے، اور رفتہ رفتہ ہزاروں سادگیوں اور پرکاریوں کے بعد مسلمانوں صرصر وسموم کو چٹکیوں میں اڑا دینے والے مسلمانوں، ریگستانوں کے شہریار مسلمانوں، آندھیوں کا رُخ بدل دینے والے، اور تیغوں کی چھاؤں میں پل کر پروان چڑھنے والے مسلمانوں کی گردنوں میں آہستہ سے محکومی کا طوق ڈال دیتا ہے اور اپنی ٹھنڈی اور سفید پیشانی پر تیموری تاج کو کج کر کے اسلامی خون کی گرمی وسرخی پر قہقہے مارتا نظر آتا ہے۔

یہ ہے اس بدبخت ملک کی سیاسی روداد، اور تاریخی سرگزشت۔!

جو کوئی آئے ہے، نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے ؛ ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

اب رہا ہندوستان کا اخلاقی۔ معاشرتی۔ مذہبی، اور قومی معیار۔ سو اُس کے بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے اور اس پر ماتم کرنے کے لئے پتھر کا کلیجہ درکار ہے خدا کے لئے ذرا غور تو کیجئے کہ جس کمبخت ملک میں ذرا ذرا سی باتوں پر خون کی ندیاں بہہ جاتی ہوں، جہاں ایک ذرا سے اختلاف رائے اور ایک معمولی سی نکتہ چینی پر لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہوں ——— جہاں نہ کوئی ایک مشترکہ لباس ہو، نہ ایک مشترکہ معاشرت۔

نہ ایک مشترک زبان ہو ——— جہاں ،،قوم،، کے معنی ،،شیخ،، ،،سید،، ،،برہمن،، اور ،،کالیستھ،، ہوں ——— جہاں لوگ اپنے کو ،،ہندوستانی،، کہنے کے عوض ،،ہندو،، ،،مسلمان،، اور ،،سکھ،، کہتے ہوں۔ جہاں اغیار کا لباس پہن کر فخر سے اکڑا جاتا ہو، اور بیگانوں کی زبان میں کلام کر کے اپنی شرافت کا ثبوت دیا جاتا ہو، جہاں اوہام و روایات کی بنا پر انسانیت کے گریبان کو تار تار کر دیا گیا ہو، اور جہاں اینٹ چُونے کے احاطوں اور گھانس پھونس چرنے والے چوپاؤں پر انسانی خون بہا دیا جاتا ہو۔ وہاں زندگی اور قومیت پیدا ہو تو کیوں کر؟ وہاں آزادی و حریّت کا خواب دیکھا جائے تو کس طرح؟

کیا ہات مرے پہنچیں گے دامانِ تباں تک

(ب) دوسرا قہر۔ مسلمان ہونا۔

مسلسل تموّل، اور مسلسل افلاس، دونوں ابنِ آدم کے حق میں مساوی طور پر انتہائی خطرناک ہیں۔

پہلے تموّل و افلاس کے متعلق میری دو رباعیاں جو مجھے اس وقت یاد آ گئی ہیں۔ سُن لیجئے۔

تموّل۔ انسان کو رفتہ رفتہ حیوان کردے
ہر نُور کو، صد نار بداماں کردے
دولت کہ فرشتوں سے بڑھا دیتی ہے
جم جائے اگر کہیں تو شیطاں کردے

افلاس۔ ہر صاحبِ جوہر کو سُبک سر کردے
فطرت کو زبوں کرکے زبوں تر کردے
افلاس، کہ کھینچتا ہے ایماں کی طرف
کم بخت مُسلسل ہو تو کافر کردے

مسلمان ان دونوں زہروں کو پیئے ہوئے ہیں اور ان دونوں سانپوں کے ڈسے ہوئے ہیں۔

اس قوم نے کرۂ ارض کے ایک بہت بڑے حصّہ پر صدیوں حکومت کی ہے سونا چاندی پانی کی طرح بہایا ہے۔ عیش وعشرت کی موجوں میں ایک طویل مدّت تک شناور رہی ہے۔ اس کے دِن بھرے درباروں میں، اور اس کی راتیں مہکتی ہوئی زلفوں کے سائے میں گزری ہیں اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم میں وہ تمام معائب آچکے ہیں جنھیں مُسلسل تموّل پیدا کیا کرتا ہے۔

پھر تاج وتخت سے محرُوم ہوجانے کے بعد اس قوم پر ایک ایسی بے پایاں افسردگی، اور ایک ایسا غیر محدُود جمود طاری ہوگیا کہ اس کا ہر فرد حرکت بھُول گیا، اور اس قدر مبہوت ومعطّل ہوکر رہ گیا کہ تمام قوم پر ہولناک افلاس نے قبضہ کرلیا۔

اس پر بھی ان خدا کے بندوں نے بانکپن نہ چھوڑا اور اپنی طمطراق والی میرزائیت

ترک نہ کی، اور اس رفعت مآبی نے انھیں اور بھی خاک میں ملا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر وہ تمام لعنتیں مسلط ہو گئیں جو مفلسی ہمیشہ اپنے ساتھ لایا کرتی ہے۔

اب مسلمانوں کے مخصوص عادات کی فہرست یوں شروع ہوتی ہے۔

"حسد، رشک، بدگمانی، غیبت، کاہلی، تنگ نظری، دروغ گوئی۔ اسراف، لاف زنی، ناعاقبت اندیشی۔ اوہام پرستی اور غداری۔"

انگریزوں کو چھوڑیئے کہ وہ تو زندہ قوم کے افراد ہیں۔ آپ ہندوستان ہی کے دوسرے فرقوں کو لے لیجئے۔ پارسی۔ بنگالی اور کسی حد تک ہندو، سب کے سب دن بھر کے سنجیدہ امور سے فراغت حاصل کر کے اپنا شام کا وقت کسی نہ کسی تفریحی مشغلے میں صرف کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کے جس محلّے سے گزریئے۔ قبرستان کا سا سماں نظر آتا ہے۔ ہر برآمدے یا کمرے میں آپ دیکھیں گے کہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی کے پھیکے دائرے میں مسلمان پسینے پسینے بیٹھے ہوئے ہیں۔ چہرے مئی جون کے آسمان کی طرح خشک ہیں۔ زور سے "آمین" کہنے نہ کہنے پر روکھی بحثیں چھڑی ہوئی ہیں یا حُقے پی پی کر بھائیوں کے عیوب بیان کئے جا رہے ہیں۔

جس قوم میں سازش، غیبت اور مناظرے۔ شام کی تفریحوں میں شامل ہوں، اس قوم میں پیدا ہونا قہرِ خدا نہیں تو اور کیا ہے؟

دولت بغلط نبود، از سعیٔ پشیماں شو
کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

(ج) تیسرا قہر۔ یو۔ پی کا باشندہ ہونا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یو۔ پی ہندوستان کا قلب و دماغ ہے، اور یو۔ پی

اور یو۔پی کے باشندے ذہانت وذکاوت، خوش سلیقگی وتمدن، شائستگی اور علم وادب میں ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں سے ہمیشہ ممتاز رہے ہیں۔

لیکن ہر چیز کا اعتدال سے گزر جانا ایک ناقابلِ برداشت مصیبت ہوا کرتا ہے یو۔پی والے بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔یعنی ان کی غیر معمولی ذہانت ہی ان کی تباہی کا سبب بنی ہوئی ہے

یہ ایک کلیہ ہے کہ جس کا تخیل وسیع ہوتا ہے اس کا دائرہ عمل تنگ ہوا کرتا ہے یو۔پی والوں کا تخیل وسیع ہے اس لئے قدرتی طور پر ان کا دائرہ عمل تنگ ہے۔اور اس تنگیٔ دائرہ عمل نے انھیں افلاس کی بلا میں گرفتار کر رکھا ہے

ارباب عقل سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ذہانت وعسرت کا سنگم کتنا خطرناک ہوا کرتا ہے، اور اسی بنا پر یو۔پی والے ہندوستان کے دوسرے کم ذہین صوبوں میں نکو بن کر رہ گئے ہیں۔خالص علمی وادبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یو پی ایک ہولناک مقام ہے۔

یہاں کے باشندے خود تو کچھ کرتے دھرتے نہیں ہیں۔لیکن دوسرے کام کرنے والوں کا مضحکہ اڑانے میں سب سے آگے آگے نظر آتے ہیں۔

پنجاب زندہ رہنے کے اسرار کے حامل پنجاب میں اگر کوئی معمولی سا صاحب جوہر بھی پیدا ہو جاتا ہے تو اہل پنجاب اس کا ڈنکا پیٹنے لگتے ہیں، اُسے کاندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں، اور اگر کوئی اس پر کسی نوع کا اعتراض کر دیتا ہے تو سب کے سب مل کر اُس پر لوٹ پڑتے ہیں۔

لیکن یو پی والوں کا خدا بھلا کرے، یہ تو ہمیشہ آپس ہی میں دست وگریباں

رہتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی ابھرنے لگتا ہے تو سب کے سب مل کر اس کی ٹانگیں پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچنے لگتے ہیں۔

میں نے اسی اثنا میں یو۔پی والے کا ایک مضمون یو۔پی والے ہی کے خلاف دیکھا ہے اور مجھے شرم کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس کا لب و لہجہ اس شدت کے ساتھ غیر شریفانہ ہے کہ تہذیب و شائستگی کے ماتھے سے پسینہ ٹپکنے لگتا ہے۔

آپ نے ان تینوں قہروں کی روداد سُن لی؟ کیا آپ مجھ پر ترس نہ کھائیں گے؟ میں تو ایک چھوڑ ان تینوں قہروں میں مُبتلا ہوں۔ ہندوستانی بھی ہوں مسلمان خاندان میں بھی پیدا ہوا ہوں اور یوپی کا باشندہ بھی ہوں، میری حالت پر دو آنسو ہی بہا دیجئے ایک زوجۂ قوم آنسو بہانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہے؟ اور اگر جی چاہے تو میری، ہمّت کی داد بھی دے دیجئے۔ ہر چند یہ تینوں قہر کے پہاڑ میری چھاتی پر رکھے ہیں، پھر بھی اُمنڈتا اور اُبھرنا چاہتا ہوں اور اپنی قوم کو آگے بڑھنے اور زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے للکار بھی رہا ہوں۔

آفریں باد بر ایں ہمّتِ مردانۂ ما؟

قومیّت کا تخیّل

آؤ، میں تم سے کچھ کہوں، اے اپنی تاریخی عظمت پر فخر کرنے والے تنگ نظر جاہل وفاقہ مست مسلمانو:۔ اور ایسے اپنے مذہبی فلسفے کی قدامت پر اترانے والے تنگدل، وہم پرست وزبون ہمّت ہندوؤ! ہاں میں بدبخت تمہیں میں سے ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ خون کے رشتے کبھی منقطع نہیں ہوتے ہیں، تو میں تم سے کیونکر جدا ہو سکتا ہوں؟ میں اس پر فخر کروں یا ماتم؟

ہاں ایسے اپنوں کے مقابلے میں "ساونت" ہندوؤ! اور ایسے بھائیوں کے رُوبرو "صف شکن" مسلمانو! تم حیات کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا اور انسانیت کے جسم پر کوڑھ کا داغ ہو۔

اے ہندوؤ! اور اے مسلمانو! اے بھارت ماتا کے سپوتو! تمہارے آئے دن کی خانہ جنگیوں نے تو مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ تمہارے دیر وحرم اور ناقوس و اذان کے جھگڑوں نے مجھے کف دردہاں، اور آتش بجاں بنا دیا ہے میں تو دیوانہ وار خود اپنی بوٹیاں نوچ رہا ہوں۔ خدا کے لئے بتاؤ کہ میں نرم لہجہ کہاں سے لاؤں؟ جو غصّے کی شدّت میں دانت پیس رہا ہو، کیونکر مسکرا سکتا ہے؟ اور کیا ایسے سنگین، اور دوزخ کی طرح بھڑکتے ہوئے موقع پر، مسکرانا، ایک انتہا درجے کا

بزدلانہ نفاق نہیں کہا جا سکتا؟

میں آج کی صحبت میں گھڑی گھڑی سناؤں گا، جی کھول کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑونگا میں تو تمہاری صفوں میں سے آندھیوں کی طرح گزروں گا۔ تمہارے بے مغز سروں پر کڑی کمانوں کی طرح کڑکوں گا، اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجوں گا۔

اس وہم میں نہ پڑنا کہ تم سے ڈر جاؤں گا۔ سنو میں ایک ایسا کفن بردوش اور سر بکف انسان ہوں جو ہر سانس میں موت سے کھیلتا، اور فرشتۂ اجل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہتا ہے۔

ہندوستان کی اُس گزری ہوئی عظمت کی قسم، جو اب گلیوں میں برہنہ سر ماری ماری پھر رہی ہے۔ اور جس کا واپس لانا ہر اُس ہندوستانی پر فرض ہے جو اپنی ماں کی عصمت پر فخر کرتا ہو، کہ میں موت سے نہیں ڈرتا، مرنے سے ڈرنے والے صرف بزدل ہی نہیں، احمق بھی ہیں۔ میں تو ایک مدت سے پکار پکار کر کہہ رہا ہوں۔ ع۔

اے اہلِ دہر! موت سے ڈرنا حرام ہے

ایک مرتبہ میرے ایک ،، دوست ،، نے مجھ سے کہا تھا "دو خاں صاحب کھانے پینے میں اتنی بے ضابطگی نہ برتا کیجئے، ورنہ مرجائیگا،، اور مجھے یاد ہے میں نے جواب میں کہا تھا،، بھئی مجھے سب سے زیادہ گھٹیا قسم کی دھمکی نہ دیجئے۔

اب کوئی میرے لئے حدِ ترقی نہ رہی

اک جھجک موت کی باقی تھی، سو وہ بھی نہ رہی

اے ،، بہادر،، ہندوؤ، مسلمانو! کہہ چکا ہوں، اور پھر کہتا ہوں کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ـــــ اچھا ہے مجھے تمہیں میں سے کوئی موت کے گھاٹ اُتار کر مجھے

ہندوستان کی اس بے حمیت زندگی کے پاپ سے چھڑا دے ــــ میں تمہارے کھردرے ہاتھوں سے بھوکا اور پیاسا قتل ہو جانے کو اس سے کہیں زیادہ پسند کروں گا کہ انگلیا کی پری رخساروں کے نازک ہاتھوں سے آبِ حیات نوش کروں

ہاں میں تم پر بیحد برافروختہ ہوں، میں تم سے بدرجۂ اتم ناخوش ہوں، تم پر میرا غیظ و غضب بپھرے ہوئے دیوتاؤں کا غیظ و غضب ہے۔ کاش میں تم سے نفرت کر سکتا کاش میں تم سے نفرت کر سکتا! کاش میں تم سے نفرت کرنے پر قادر ہوتا!!

یاد رکھو اے افلاطونو، اے بقراطو! اگر تم میں عقل ہو، اور تمہارا حافظہ عاقلانہ باتوں کے محفوظ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو یاد رکھو کہ وہ تلخ گفتاری جس کی تہ میں امرت لہریں لے رہا ہو، اس شیریں کلامی سے کہیں بہتر ہے، جس کے سبزے کے نیچے زہر ہلاہل رہا ہو میں دریافت کرتا ہوں کہ وہ غصہ، قابلِ قدر نہیں ہے، جس کی بنیاد محبت پر قایم ہو۔

سنو، اے سسکتے ہوئے پامال ہندوستان کے سوا تینتیس کروڑ غلام سُورماؤ! اے ،،گائے، باجے،، پر حیات کی سی مقدس شے، اور ،،ناقوس واذان،، پر بھائیوں کے خون کی سی متاعِ عزیز کو بھینٹ چڑھا دینے والے دوپاؤں کے جانورو! تم نے ہندوستان کو ذلیل کر ڈالا ہے، تم نے انسانیت کو رسوا کر دیا ہے۔ تم نے آدمیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے، تم نے نوعِ انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ تم نے حُبِّ وطن کو کُند چھری سے حلال کر ڈالا ہے۔

جامۂ انسانیت کے پرزے ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں ــــ لباسِ وطنیت کی دھجیاں فضا میں رقص کر رہی ہیں۔ یہ ہیں تمہاری پتنگ بازیاں، یہ ہیں تمہارے لہراتے ہوئے پرچم! اور اے میرے بہکے یا بہکائے ہوئے عزیزو! یہ ہیں تمہارے کرتوت!!

کیا تم شرم سے سر جھکا لینے پر اب بھی آمادہ نہیں؟

تمام دنیا کی برادری، اور قومیت کے تصور کا "وطن"، اور "انسانیت" پر مدار ہو اکرتا ہے ـــــ اور یہی عاقلانہ و فطری دستور بھی ہے۔

لیکن تمہاری برادری، اور قومیت کے تصور کی کس چیز پر بنیاد ہے؟ ٹھہرو، ذرا ٹھہرو ـــــ غصّے کے مارے مجھے اپنے سینے سے تھرتھرائی ہوئی آنچ کی سنسناہٹ سنائی دے رہی ہے۔

لیکن کیا سانس روک کر اور غصّے کو ضبط کر کے مجھ نامراد و بدبخت کو یہ کہنا نہ پڑیگا کہ تمہاری برادری، اور قومیت کے تصوّر کو "وطن" اور "انسانیت" وہ الفاظ ہیں جو تمہاری فرہنگ میں درج ہی نہیں کیے گئے ہیں؟

ہاں اے عقل کے دشمنو! تمہاری برادری تو "عقائد" "رسوم" کی برادری ہے۔ تمہاری قومیت تو "روایات" و "اوہام" کی قومیت ہے

اگر میں ہندوستان سے باہر جاؤں، اور کوئی خدا کا بندہ خدا ناکردہ مجھ سے سوال کر بیٹھے کہ تیرے ہندوستان میں قومیت کا تصوّر اور برادری کا معیار کیا ہے، تو تمہیں بتاؤ، کیا میں شرم سے زمین میں گڑ نہ جاؤں گا

کیا میں اس سے یہ کہنے کی جسارت کر کے زندہ بھی رہ سکتا ہوں کہ میرے ملک میں "وطن" اور "انسانیت" کا کوئی معیار نہیں ہے، میرے ملک میں کوئی اس بنا پر بھائی نہیں ہو سکتا کہ وہ میرا ہموطن ہے۔ میری ہی طرح ایک انسان ہے۔ میرے ہندو مسلمانوں کو تو اگر اجنبی شخص کے متعلق بھی یہ علم ہو جائے کہ وہ انھیں کی ترکیب کے مطابق برہمن مانجھتا ہے، انھیں کے رسوم کے موافق ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر عبادت

کرتا ہے۔ اُنھیں ہی کی طرح ایک خاص گھوڑے کو سلام کرتا ہے۔ اور انہیں کے عقائد کی مطابقت کرتے ہوئے بندروں کی ایک خاص قسم کو اپنا پیشوا سمجھتا ہے، تو وہ دیوانہ وار نعرہ لگاتے ہوئے اُس کی طرف دوڑیں گے، اُسے گلے لگائیں گے۔ اور اس کے غلاموں تک کو اپنی برادری میں شامل کرلیں گے۔ لیکن "وطن" و "انسانیت" کے نام پر کسی کو بھائی نہ سمجھیں گے۔

اے میرے ہندوؤ، اور مسلمانو! ماتم ہی کرنے کی نہیں، مرجانے کی بات ہے کہ کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی شائستہ و شریف کیوں نہ ہو اس قدرتی و فطری بنیاد پر تمہارا بھائی نہیں ہوسکتا کہ وہ تمہارا ہموطن ہے اور تمہاری ہی طرح ایک انسان ہے تم تو اپنی قومیّت، اور برادری کے حلقے میں صرف اُس شخص کو داخل کرسکتے ہو جو تمہارے عقائد و روایات کے مطابق ٹخنوں سے اونچا پائجامہ پہنتا ہو، شانے پر چوخانے کا رومال ڈالتا ہو، اُس کے ماتھے پر سیاہ دھبّا ہو۔ اُس کی مونچھیں تمہاری مرضی کے مطابق خوب کتری ہوئی ہوں، وہ ایک خاص انداز سے کچھ خاص کلمات ادا کرتا ہو۔ حلوؤں اور مٹھائیوں پر کچھ بڑ بڑ اور بڑ بڑا کر شیریں کام ہوتا ہو، اور ڈاڑھی اتنی دراز رکھتا ہو کہ حریف اگر چاہے تو اُسے مٹھی میں پکڑ کر اپنے طمانچہ کو زیادہ شدّت کے ساتھ کامیاب بنا سکتا ہو۔

تم تو اپنی برادری میں صرف اس شخص کو داخل کرسکتے ہو جو گلے میں ایک ترچھا ڈورا ڈالتا ہو، جسے غسلخانہ میں کان سے لپیٹ لیا جاتا ہو، جو اپنے جسم پر بھبھوت ملتا ہو، جس کی چاندپر بالوں کا ایک گچھا ہو، ایسا گھنا ہو کہ دشمن اگر اسے گرفت میں لے لے تو جسم کو اوپر اٹھا کر گڑھے میں ڈال سکتا ہو۔ وہ ایک خاص چوپائے کے فضلے پر

پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہو، وہ اپنے بھائی اور باپ تک کو نجس تصور کرتا ہو۔ اور ان کے ہاتھ کی پکائی ہوئی چیز کا کھانا حرام سمجھتا ہو۔ جس کا ایمان پانی کی ایک بوند سے پگھل جاتا، اور جس کے ماتھے پر موٹی موٹی رنگین لکیریں اس طرح بنائی جاتی ہوں کہ ماتھا دیوالی کی کلیھا سے ملنے لگے

تم تو اپنی برادری میں اس شخص کو داخل کر سکتے ہو جو ہاتھ میں لوہے کا ایک کڑا پہنتا ہو۔ سر پر پگڑ باندھتا ہو، تمباکو کی محض خوشبو سے قتل پر آمادہ ہو جاتا ہو۔ جس کے جسم کو قینچی یا اُسترا مرتے دم تک نہ چھو سکتا ہو۔ اور جس کا سر۔ منہ۔ ہونٹ، گلا۔ گدّی گردن سب بالوں کے جھنڈ میں اس طرح چھپے ہوئے ہوں گویا اندھیرے میں ایک بڑا ناریل پڑا ہوا ہے۔

تمہارے حلقے میں تو صرف وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جو کانوں میں انگلیاں دیکر عبادت کا آوازہ بُلند کرتا ہو، گویا گردن کی رگیں پھلا کر تو بنیاں بجاتا ہو۔

تمہاری برادری میں تو صرف اُس شخص کو بار مل سکتا ہے جو تمہاری مرضی کے مطابق ایک خاص طرز کا لباس پہنتا ہو، ایک خاص سمت پاؤں نہ پھیلاتا ہو، اور ایک خاص طرف مُنہ کر کے کلّی نہ کرتا ہو۔

اور اے صاحب عقل و حکمت ہندو، مسلمانو! تمہاری قومیت اور برادری کی مُہر تو صرف اُسی کی پیشانی پر ثبت کی جا سکتی ہے جو چھینک آتے ہی ،، الحمدللہ،، کہتا ہو یا جماہی آتے ہی ناک کے پاس ہاتھ لیجا کر چٹکیاں بجانے لگتا ہو۔

اور اگر ان باتوں میں سے کسی ایک ادنیٰ سی بات میں بھی، کوئی تمہارا ہموطن جو فطری طور پر تمہارا بھائی ہے، زیادہ نہیں، ایک خفیف سا بھی تم سے اختلاف

رکھتا ہو۔ تو تمہارا خدا اور تمہارا پرماتما تمہیں حکم دے دیتا ہے کہ تم اسے گالیاں دو، کوڑے مارو۔ شہر بدر کر دو، سُولی پر چڑھا دو۔ قتل کر ڈالو۔ جلا دو، پھُونک دو، بھُون ڈالو بھسم کر دو۔ اس کے گھر میں آگ لگا دو۔ اس کے بال بچوں کو اسے دِکھا دِکھا کر ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اُتار دو اور اس کی بہو بیٹیوں کی شارعِ عام پر اس طرح عصمت دری کرو کہ شیطان تک کے ماتھے سے غیرت کا پسینہ ٹپکنے لگے

کیوں؟ یہی ہے نا تمہاری برادری، تمہاری قومیت، اور تمہاری شرافت کا معیار؟ کیا تم سُن رہے ہو؟ سچ مُچ سُن رہے ہو؟ اور حیرت ہے کہ اب بھی شرم سے تمہاری آنکھیں نیچی نہیں ہیں؟

تم آزادی کا مطالبہ کرتے ہو۔ حالانکہ تمہیں زندہ رہنے کا حق بھی نہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ غلامی کی رُوح کو بھی تم سے منسوب ہوتے ہوئے بے غیرتی محسوس ہوتی ہے۔ تو تم غلامی سے بھی پست تر ہو۔ میں تمہیں کیا خطاب دوں؟

ہر ہاتھ میں تیغِ خونچکاں ہے یارب ہر پاؤں میں زنجیر گراں ہے یارب
مذہب کی برادری سے دل تنگ ہوئیں انسان کی برادری کہاں ہے یارب

سُنو۔ سُنو۔ شاعر کی دردناک آواز گنگا جمنا کے کناروں پر گونجتی ہے؟

صرصر ہے کوئی، تو موج طوفاں کوئی خنجر ہے کوئی، تو تیغِ بُرّاں کوئی
انساں ہے کہاں، کس گڑھے میں گم ہے؟ یاں تو کوئی ہندو ہے مسلماں کوئی

اے مُورکھ ہندوؤ، اور اے نادان مسلمانو! کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے؟ کہ تم نے جو تفریق کی چِھپیاں اپنے اپنے ماتھوں پر چپکا رکھی ہیں، اُنھیں چھڑا کر جیبوں میں رکھ لو اور اپنی اِن فرضی اور جھُوٹی قرابتداریوں کو اُس مقدس و عظیم قرابت کی قربانگاہ

بھینٹ چڑھا دو جو حقیقی اور فطری ہے؟

"دین، دین" - "دھرم، دھرم" کلیجہ پیپ ہوا جاتا ہے۔ اِن جھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے، کانوں میں زخم پڑے جاتے ہیں۔ اِن مولویوں اور پنڈتوں کی نامراد صداؤں سے۔

اے بھائیو! اے عقل و حکمت کے دشمن بھائیو! اے زمین پر فساد برپا کرنیوالے بھائیو! تمہاری کِس کِس بات پر رُوؤں؟

اے دھوتی اور پاجامے کے گروہو، اے لوٹے اور بدھنے کی انجمنو، اور اے داڑھی اور چٹیا کے اِدارو! تمہاری کِس کِس حماقت پر غور کروں؟

میں تمہارے جُنونِ خانہ جنگی، اور ذوقِ محکومی و کفش برادری کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اب تو خیر سے تمہارے پانی اور تمہاری چائے نے بھی دین اور دھرم کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے

بہ مکتب می رود طفلِ پری زاد
مُبارک باد مرگِ نو بہ اُستاد

کیا تم ریلوے اسٹیشنوں پر "مسلمان پانی" اور "ہندو چائے" کی ناپاک آوازیں نہیں سنتے ہو کیا تم اس قدر بےحیا ہو کہ اِن آوازوں کی گونج میں بھی تم کھڑکی سے باہر سر نکالتے ہو اور پلیٹ فارموں پر اُتر کر غیر دنیا کو منھ دکھانے کی جرات کرتے ہو؟

اور کیا کبھی تم نے یہ مطالعہ نہیں کیا ہے کہ "تمہارے مسلمان پانی" اور "ہندو چائے" کے ذلیل نعروں کی گونج، اغیار کے چہروں پر سُرخی بن کر کھیلنے لگتی ہے؟

اے میرے نادان دوستو! اے ہندوؤ، اور اے مسلمانو! خدا تمہیں انسان بننے کی توفیق دے ——— اگر تم سب کو ایک ہی لباس میں ملبوس کر کے کسی وسیع میدان میں کھڑا کر دیا جائے، تو کیا تمہاری صورتیں دیکھ کر کوئی مسخرا کہہ سکتا ہے کہ یہ ہندو ہے اور

وہ "مسلمان"

کیا تمہاری شکلیں، لہجے، آواز، چال ڈھال، رنگ روپ، قد و قامت، مزاج اور عادات و اطوار یہ تمام چیزیں بلا استثنا ایک دوسرے سے نہیں ملتی ہیں؟

کیا تمہارا گوشت، پوست، خون اور ہڈیاں ایک نہیں ہیں؟

کیا تم اسی خاک سے پیدا نہیں ہوئے ہو، اور اسی خاک میں نہ مل جاؤ گے؟

جب موسم گرما میں، چڑچڑے اور بے مہر و مروّت موسم گرما کی تند خو ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہیں، کیا تم دونوں کے چہروں پر ایک ہی قسم کی ترش پژمردگی نہیں پائی جاتی؟

جب گلابی جاڑے، گلابی دھوپ دیواروں سے اترنے لگتی ہے اور ہلکی ہلکی ہوا میں بسی ہوئی خوشبو تمہارے دماغوں کو معطّر کر دیتی ہے، کیا تم دونوں کے چہروں پر ایک ہی قسم کی میٹھی شگفتگی نہیں پائی جاتی؟

جب بھری برسات کی مچلتی اور برستی راتوں کی تاریکیوں میں دور کے باغ سے پپیہے کی صدا آنے لگتی ہے تو کیا تم دونوں کسی بچھڑے ہوئے کی یاد میں آنسو نہیں بہانے لگتے ہو؟

سچ کہو کیا ایک ہی موسم کی ہوائیں تمہیں جھولا نہیں جھلاتیں؟ کیا ایک ہی فضا میں تمہاری مسیں نہیں بھیگتیں، کیا تم پر ایک ہی قسم کے باغوں میں ہو اکھا کر جوانی نہیں آتی۔ کیا تم ہندوستان ہی کی مہ جبینوں سے دل نہیں لگاتے۔ کیا ایک ہی سرزمین کے پھول تمہارے سہروں میں نہیں مہکتے۔ اور کیا ایک ہی دلفریب انداز سے تمہاری دلہنیں نہیں شرماتیں۔

اے ہندو مسلمانو! حیران ہوں، جنوں کی حد تک حیران ہوں کہ اس یکملّی یک جہتی

دیک رنگی اور اس زبردست ظاہری و باطنی وحدت کے باوصف تم ایک دوسرے کو غیر کہتے ہو، دشمن سمجھتے ہو۔ ایک دوسرے کا خون بہاتے ہو!!

اے ہندوؤ! اے اپنی ”آسمانی“ کتابوں اپنے ”اوتاروں“، ”دیوتاؤں“ اور ”پیغمبروں“ کو رسوا کرنے والے دیندار بے دینو! اور دھرمی اُدھرمیو! تم احمق بھی ہو۔ مسخرے بھی، تم بدبخت بھی ہو اور درندے بھی۔

تمہارے منہ سے اپنے بھائیوں کے کچے گوشت کی بُو آرہی ہے، تمہارے پنجے خون سے رنگین ہو رہے ہیں۔

تمہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پنجے کھلے ہوئے ہیں۔ آنکھیں نفرت سے اُبلی ہوئی ہیں، تمہاری زبان بار بار باہر نکل پڑتی ہے۔ تمہارے جبڑے کھل رہے ہیں۔ تم غرّا رہے ہو۔ تمہارے دانت باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اور تم بس اب حملہ کیا چاہتے ہو۔ اے بہکے یا بہکائے ہوئے ہندوستانیو! میں پوچھتا ہوں تمہاری کھوپڑیوں کے اندر بھیجا ہے کہ پگھل گیا، تمہارے دماغی نلیوں میں رطوبت باقی ہے کہ خشک ہو چکی؟

میں کیونکر، اور کن آگ اور بجلی سے بنے ہوئے الفاظ میں تم سے کہوں کہ اے ازار اور دھوتیوں کے رسیو، آگاہ ہو کہ تمہارے دماغ اندھیرے اور گہرے غاروں میں گر چکے ہیں، تمہاری عقلیں گندے نالوں میں بہتی پھر رہی ہیں، تمہاری ذہنیت کے عقاب سڑی ہوئی مردار لاشوں پر منڈلا رہے ہیں۔ تمہاری بصیرت جلتی ہوئی ناپاک ہڈیوں کے دھوئیں میں گردش کر رہی ہے اور تمہارا ایمان، شیطان کے سب سے زیادہ تاریک کارخانے میں مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال رہا ہے۔

میں تمہاری کس کس بات پر ماتم کروں اے بدبخت ہندوؤ۔ اور اے بدقسمت

مسلمانو! تم اپنے راہبروں اور لیڈروں کو پہچانتے ہو کیا یہی تمہارے لیڈر رہے ہیں؟ کیا سچے راہبروں کی صورتیں ایسی ہی نورانی ہوا کرتی ہیں۔ کیا مخلص لیڈروں کے چہرے چوروں، ڈاکوؤں، قزاقوں، اور غداروں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں؟ اور کیا ان کے اعمال و اقوال یہی ہوا کرتے ہیں جو تمہارے لیڈروں کے ہیں؟

ہوشیار رہو، ہوشیار! یہ سچے لیڈر اور حقیقی وطن پرست نہیں ہیں۔ یہ تو ڈاکو "محافظ"، "راہزن" "راہبر"، شیطان "اوتار"، اور کافر "پیغامبر" ہیں۔ اگر تمہاری عقلوں پر پتھر نہ پڑ گئے ہوتے" تو کیا تم ان بھیڑیوں کو گلے کا نگہبان بنا سکتے تھے۔؟

بچو، بچو، اپنے کانوں کو اُن کے لبوں سے دور رکھو۔ ان کے الفاظ بچھو، بھورے بچھوؤں کے ڈنک ہیں۔ جو کانوں کے پردوں میں اس طرح اتر جاتے ہیں کہ دفعتہً کھوپڑی شق ہو جاتی ہے۔

دیکھو اے ہندوؤ اور مسلمانو! اب بھی امید باقی ہے۔ اب بھی زہر پورا نہیں چڑھا ہے۔ اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے، اور اب بھی سویرا ہے، آپس میں اس طرح شیر و شکر ہو جاؤ کہ سائنس کا کوئی آلہ تمہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے اور دنیا کی کوئی ضرب تمہاری محبت کے بہتے ہوئے پاک دھارے کو پھاڑ نہ سکے۔

اور اگر شیطان کے کان بہرے، تمہ نے بنصیب اعدار اپنی متحدہ قومیت کا آوازہ جلد تر نہ بلند کیا تو دیکھو، آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھو، بلندیوں سے ایک آرا اترتا چلا آ رہا ہے۔ وہ تمہیں عنقریب یوں کاٹ دے گا کہ تم میں سے ہر شخص کی لاش دو برابر کے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور چونکہ زندگی میں تم ایک بنکر نہیں، دو بنکر رہنے پر مُصر ہو۔ مرنے کے بعد دو نہیں چار ہو جاؤ گے

آج بھائی سے نہیں ملتے ہو، کل خود سے بھی نہ مِل سکو گے۔ تمہاری لاش کا آدھا ٹکڑا مشرق میں ہوگا۔ آدھا مغرب میں!

ہوشیار اے ہندو! ——————— خبردار اے مسلمان!!

ہو چکے ہیں مشورے تیری قضا کے واسطے

جاگ اُٹھ اب بھی سویرا ہے خدا کے واسطے!!!

غلامی کے نظارے

بڑی بڑی باتیں تو سب کی نظر آتی ہیں، آیئے چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگاہ کریں اور دیکھیں کہ ہماری قوم کی ذہنی کیفیت کیا ہے؟

لوگ بڑے بڑے واقعات کو دیکھنے کے خوگر ہیں۔ حالانکہ اس ناقابلِ فہم دنیا میں ہر معمولی سا واقعہ بھی ایک زبردست سانحہ اور ہر چھوٹی سی بات بھی ایک عظیم حادثہ ہے۔

پہاڑوں کو سب دیکھتے ہیں، حالانکہ ایک ذرے میں بھی وہ سب کچھ موجود ہے جو پہاڑ میں وسیع و بلند ہو کر نمایاں ہو گیا ہے۔ لوگ ہاتھی کو غور سے دیکھنے لگتے ہیں حالانکہ بظاہر حقیر سی چیونٹی میں بھی وہ سب موجود ہے جو ہاتھی بنکر ظاہر ہو گیا ہے۔

پہلے میں آپ کو بازاروں میں لے چلوں گا۔

(الف) دیکھئے یہ تمام دوکانیں ہندوستانیوں ہی کی ہیں، اس سرے سے اس سرے تک نگاہ ڈال لیجئے، کہ تماشائی اور گاہک بھی تمامتر ہندوستانی ہی ہیں۔ جو پیدل چل رہے ہیں۔ وہ بھی ہندوستانی ہیں۔ جو سواریوں میں گزر رہے ہیں۔ وہ بھی ہندوستانی ہیں۔ اور جو سواریاں چلا رہے ہیں۔ وہ بھی سب کے سب ہندوستانی ہی ہیں لیکن بازار کے اس شدت سے ہندوستانی ہونے کے باوجود، ذرا دوکانوں کے تختے

دسائن بورڈ ملاحظہ فرمایئے کہ سب کے سب انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں۔
اگر آپ آنسو نہیں بہا سکتے تو کم سے کم ایک ٹھنڈی سانس ہی بھر لیجیے
کیا ان خدا کے بندوں کو حکومت نے انگریزی بورڈ لگانے پر مجبور کیا ہے یا
ان کے مذاہب نے دیسی زبان کے استعمال کو "لحم خنزیر" قرار دیکر حرام کر دیا ہے؟
شاید ہماری تجارت کے نمائندے، جو در اصل بدیشی تجارت ہی کے ایجنٹ ہیں
یہ فریاد یں کہ اس ملک میں چونکہ انگریز فرمانروا ہیں اس لئے ان کی رعایت و آسانی کی
خاطر انگریزی حروف کے بورڈ لگائے جاتے ہیں۔
لیکن یہ سراسر غلط بیانی ہے، یا کم سے کم غلامانہ نفس کا ایک فریب ہے جو خود
اپنی ہی ذات کو دیا جا رہا ہے۔
سنئے اول تو پورے ہندوستان میں انگریزوں کی آبادی ہی کتنی ہے اس کے
علاوہ ہر بڑے شہر میں خود انگریزی دکانیں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ اور انگریز قوم کا
یہ ایک زبردست اصول ہے کہ سودا خواہ کتنا ہی گراں کیوں نہ پڑے وہ ہمیشہ اپنے
ہم قوموں ہی کی دوکانوں میں خریداری کرتی ہے۔ بعض کم حیثیت یا بخیل قسم کے انگریز
کبھی کبھی ہماری دوکانوں کی طرف ضرور چلے آتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ گاہ گاہ کی آمد
ہرگز اس حد کی اہم نہیں ہو سکتی کہ لاکھوں اور کروڑوں مستقل ہندوستانی گاہکوں کی
اہمیت کو پس پشت ڈال کر اپنی زبان میں بورڈ لگانا ہی ترک کر دیا جائے۔
یاد رکھیے جو قوم اپنوں کی عزت نہیں کرتی اور اپنی زبان کو حقیر سمجھتی ہے، وہ
آزاد ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔
خیر یہ تو بڑے شہروں کا ذکر تھا، آیئے ذرا قصبوں اور دیہاتوں کے بازاروں کی

کی سیر کریں۔ جہاں ایک انگریز بھی نہیں رہتا۔ اور نہ برسوں اُدھر سے کوئی انگریز گذرتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ ان دو کالونیوں میں جو مال ہوتا ہے وہ اس شدت کے ساتھ ٹھیٹ ہندوستانی ہوتا ہے کہ انگریز اس سے واقف بھی نہیں ہوتے، لیکن ماتم کرنے کا مقام ہے کہ وہاں بھی اکثر بورڈ آپ کو انگریزی ہی میں ملیں گے۔

اِس سلسلے میں ایک سب سے زیادہ مضحک اور شرمناک صورت حال بھی ملاحظہ فرمایئے، یعنی آپ کی بہت سی دو کالونی پر اُردو سائن بورڈ بھی نظر آتے ہیں، لیکن آپ خوش نہ ہوں بلکہ روئیں اس لئے کہ وہ ہوتے تو ہیں اُردو حروف میں، لیکن اُن کے الفاظ تمامتر انگریزی ہی ہوتے ہیں۔

"دی فائن آرٹس گیلری" "دی جیلانی کلاتھ مرچنٹس" "دی قنوج پرفیومرز" "دی گڈ بوٹ فیکٹری"۔

کوئی اِن دشمنانِ عقل و خرد اور غلامانِ مادرزاد سے پوچھے کہ اے دانشمندو! یہ بورڈ کس قوم کی خاطر آویزاں کئے ہیں۔

انگریزوں کی خاطر؟ انگریز تو اس کا ایک حرف بھی نہیں پڑھ سکتا۔

انگریزی داں ہندوستانیوں کی خاطر؟ وہ تو انگریزی ہی میں پڑھ سکتے تھے۔

انگریزی سے ناواقف ہندوستانیوں کے لیے؟ ہاں اسی کو عقل کی آنکھیں پھوٹ جانا کہتے ہیں۔ اور یونہی کیا جاتا ہے اپنی دوں فطری کا اعلان۔

(ب) اب بازار سے آئیے "تعلیم یافتہ طبقہ" میں۔

اس بحث کو سردست چھوڑئیے کہ اس گروہ کو "تعلیم یافتہ" کہہ بھی سکتے ہیں؟ اور سردست اس سوال کو بھی نہ اٹھائیے کہ اُنہیں سند یافتہ جاہل کیوں نہ کہا جائے

اس وقت تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے تاجروں کے مقابلے میں ان کی ذہنیت کتنی بلند ہے۔

ذرا نظر اٹھا کر دیکھیے، یہ ایک "تعلیم یافتہ" نوجوان گریجویٹ آپ کے سامنے کھڑا ہوا پائپ پی رہا ہے۔ کوٹ، پتلون، ٹائی، کالر، اور ہیٹ، سیاہ چمکتا ہوا جوتہ قمیص کے سخت کف کوٹ کی آستینوں سے جھلکتے، اور رنگین رومال کا ایک کونا کوٹ کی جیب سے جھانکتا ہوا، اور جیب میں نامنظور شدہ درخواستوں کا انبار، یہ لیجیے اس کا ایک دوست آتا ہے، اور انگریزی میں بات چیت ہوتے ہوتے اردو یوں شروع ہوتی ہے "کل رات سے میری وائف کو ہیڈیک بہت اپ سٹ کیے ہوئے تھے" میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا، انھوں نے جو دوا پراسکرائیٹ کی ہے۔ اسے لینے جا رہا ہوں۔ کہا تمہارے فادر کی ہیلتھ اب کیسی ہے۔ سنا ہے وہ لانگ لیو پر آؤٹنگ کے واسطے جانے والے ہیں"۔

میں پوچھتا ہوں "وائف" کے عوض "بیوی" کہنے سے کیا ان کی اہلیہ محترمہ بے پردہ ہو جاتیں ہیں؟ اور "فادر" کے بدلے "باپ" کہنے سے کیا ان کے والد بزرگوار کی عزت اور ان کے تن و توش میں کوئی کمی آجاتی؟

دیکھیے چند "تعلیم یافتہ" چائے پی رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے انگریز چائے میں شکر کم استعمال کرتے ہیں۔ میزبان دریافت کرتا ہے۔ دل مسٹر محمود ہاؤ مچ شوگر"؟ اور مسٹر محمود سفید کالر میں اپنی کالی گردن کو فرنگیوں کی طرح جھٹک کر فرماتے ہیں، صرف ایک "ٹی سپون فل"، اور یہ کہتے ہی اپنے گرد و پیش بیٹھے ہوئے احباب کو فخر کے ساتھ دیکھ کر جیب سے نکلے ہوئے رومال کی کونے

پر نگاہیں جما دیتے ہیں۔

اب ذرا ناموں کی کتر بیونت ملاحظہ ہو۔

حضرت کا نام ہے، زاہد علی جعفری۔ مگر لکھیں گے" زیڈ اے جعفری۔ نام ہے تجمل حسین رضوی، تحریر فرمائیں گے" ٹی۔ ایچ رضوی،، اور اگر اسم گرامی ہو طاہر بیگ قادری، تو حضرت اچھے خاصے" ٹی بی قادری بن کر رہ جائیں گے۔

انگریزوں میں ایک دیا سلائی سے تین سگریٹ جلانا فال بد سمجھا جاتا ہے۔ یہ حضرات ان کے اوہام کے بھی ورثائے حقیقی واقع ہوئے ہیں، ایک دیا سلائی سے دو سگریٹ جلاتے ہی ایک خاص فخر آمیز آواز کے ساتھ" ہُھو،، کی آواز نکال کر دیا سلائی بجھا دی جاتی ہے اور اس کے بجھتے ہی ان کی آنکھوں میں غرور تہذیب کا شعلہ تھرتھرانے لگتا ہے۔

اکثر انگریزوں اور بالخصوص میموں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ اثنائے کلام میں وہ اپنے شانوں کو ایک ادائے خاص سے جھٹک دیا کرتی ہیں چنانچہ یہ چیز بھی ہمارے "تعلیم یافتہ حضرات نے خیر سے چرا لی ہے"، اور خواہ موقع ہو کہ نہ ہو، یہ غریب اثنائے گفتگو میں برابر اپنے شانے جھٹکتے رہتے ہیں۔

ہمارا سب سے بہتر لباسِ خواب ڈھیلے پائجامے اور کرتے ہو سکتے ہیں۔ مگر آپ جس مغرب گزیدہ کی خواب گاہ میں جائیں گے۔ تو حسرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ دھاریوں والے پتلون کی میانی ایک چھوٹے سے کوٹ کے نیچے لٹکی ہوئی ہے۔

ہندوستانی پردہ

مسلمانو! خدا لگتی کہنا، کیا تم اپنے خدا اور اپنے رسول دونوں سے زیادہ عزت مند نہیں سمجھتے؟ ایک دم سے بھڑک نہ اٹھو، بے سمجھے بوجھے مشتعل ہو۔ دوسروں کی باتیں صبر کے ساتھ سننے کی عادت ڈالو، یقین مانو، ہر وہ بات جو تمہارے مزاج کے خلاف ہو، لازمی نہیں کہ ہمیشہ غلط ہی ہو۔ بات سنتے ہی جامے سے باہر ہوجانا، آدمی کے واسطے زیبا نہیں۔ یہ روش تو یادش بخیر اس عہد کی یادگار ہے جب ہمارے اجداد جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔

سنو! میں بالفاظ دیگر تم سے پھر یہی سوال کرتا ہوں کہ اے پردے کے حامی مسلمانو! اے اپنی عورتوں، اور اپنی آئندہ نسلوں کے قاتلو! کیا واقعی تمہارا پردہ یہ غیر ملفوظ اعلان نہیں ہے کہ تم اپنے خدا اور اپنے رسول، دونوں سے زیادہ غیرتمند واقع ہوئے ہو؟

تم سمجھے بھی میں کیا کہہ رہا ہوں؟ تم سے یہ مجھے یہ سخت شکایت ہے کہ تم بیداری و زندگی کی باتوں کو بہت دیر میں سمجھا کرتے ہو۔ نہیں یہ بھی میں تمہاری خوشامد کر رہا ہوں۔ حالانکہ واقعہ تو دراصل یہ ہے کہ زندگی و بیداری کی باتیں سمجھنے کی تم میں کئی صدیوں سے صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے۔

لیکن اس باب میں تم سخت مجبور بھی ہو۔ تمہاری صلاحیتوں کو تو نہایت چالاکی کے ساتھ سُلا دیا گیا ہے۔ تمہاری عقلوں پر تو لقمہائے حرام کے پیچھے دوڑنے والے ریاکار "عالمانِ دین متین" اور "گندم نُما"، صوفیائے خانقاہ نشین" کی جھوٹے وضو کے پانی سے پالی ہوئی سفید و سیاہ ڈاڑھیوں کی دُھوپ چھاؤں کے مضبوط جال تنے ہوئے ہیں۔

تمہاری عقلیں اُس جال کے نیچے پھڑک رہی ہیں اور لُطف تو یہ ہے کہ تم اس پھڑکنے کو اتباع کتاب و سنت کی چہل پہل سمجھ رہے ہو۔

ہاں تو میں تم سے دریافت کر رہا تھا اے "عُلماء زدہ" اور "صوفیا گزیدہ" بھولے مسلمانو، کیا واقعی تم اپنے کو اپنے خدا اور رسول، دونوں سے زیادہ غیرتمند نہیں سمجھتے؟

میرا مُدعا صاف لفظوں میں یہ ہے کہ جب تمہاری کتاب، یا یوں کہو تمہارا خدا، عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے اور تمہارا رسول، عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم صادر نہیں فرماتا، تو پھر یہ تمہارا پردہ کیا اس بات کا گستاخانہ و کافرانہ اعلان نہیں ہے کہ تم نعوذ باللہ اپنے خدا اور اپنے مُقدس رسُول، دونوں سے زیادہ غیرتمند واقع ہوئے ہو؟

کیا تم نے اپنی کتاب کے آیاتِ حجاب کا مطالعہ خود کیا ہے؟ یا اپنے محلّے کی مسجد کے "بڑے مولوی صاحب" ہی کے ارشاداتِ عالی پر عمل پیرا ہو؟

مسلمانو! میں سفارش کرتا ہوں کہ برائے خدا اور رسول، تم قرآنِ حکیم کی سُورہ "نِساء"۔ "نُور" اور "احزاب" کا خود مطالعہ کرو۔ اور جیسا کہ خود تم سے قرآن بار بار مطالبہ کرتا ہے، تدبّر و تفکّر سے مطالعہ کرو۔

اگر تقلیدی آوازوں کی طرف سے کان بند کرکے صحیح اسلامی طرز پر تم مطالعہ کروگے تو آنِ واحد میں یہ حقیقت تم پر کھل جائیگی کہ تمہارا یہ پردہ جس پر تم آج اس قدر اترائے پھر رہے ہو، اسلام سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا۔ بلکہ تم پر یہ بھی واضح ہو جائیگا کہ از روئے اسلام، حشر کے روز تم سے اِس ظلم و بدعت کا جواب بھی طلب کیا جائیگا، کہ کس خطا پر تم نے حوّا کی بیٹیوں کو حبس دوام کی سزا دے رکھی تھی۔

ہاں، تمہارے اس پردے کے جواز کی ایک صورت ضرور نظر آتی ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے کہ "تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بد چلنی کی مرتکب ہوں۔ تو چاہیئے کہ اپنے آدمیوں میں سے چار آدمیوں کی اُس پر گواہی لو، اگر چار گواہ بیان دے دیں، تو پھر ایسی عورتوں کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ موت ان کی عمر ختم کردے۔

اے غیور مسلمانو! تمہیں اپنی معصوم بہو بیٹیوں کی مُسلّمہ عصمت وعفّت کی قسم سچ کہو، کیا اُس وقت غصّے کے مارے تم دیوانے نہ ہو جاؤ گے، جب کوئی شوخ چشم یہ پوچھ بیٹھے گا کہ اے مسلمانو، کیا اسی حکمِ قرآنی کے اتباع میں تم نے اپنی عورتوں کو زندگی بھر کے لئے گھروں میں بند کر رکھّا ہے؟

کیا تمہیں نہیں معلوم ہے کہ خود تمہارے برگزیدہ رسُول کی زندگی میں مسلمان عورتیں باہر آتی جاتی تھیں، اپنا تمام کام کاج خود کرتی تھیں، اور غزوات میں مسلمانوں کی مرہم پٹی انھیں کے سپرد ہوا کرتی تھی؟

رسُول کی لاڈلی بیٹی فاطمہ، اور محبوب بیوی عائشہ نے کیا میدانِ جنگ میں پیاسوں کو پانی نہیں پلایا، اور مجروحوں کی خبر گیری نہیں کی؟

اللہ۔ اللہ! اے بلند مرتبہ مسلمانو! تمہاری عزت کا کیا کہنا، تمہاری بیویاں اور بیٹیاں، رسول کی بیویوں اور بیٹیوں سے بھی بڑھ گئیں۔ میں تمہیں اس صولت وشوکت پر مبارکباد دیتا ہوں!

آخر وہ اُمت کس کام کی جو اپنے رسول، اور وہ بندے کس کام کے جو اپنے خدا سے نہ بڑھ جائیں!

اے ابلیس! یہ نمایاں فتح مبارک ہو!

شاید تم میں سے کوئی اس موقع پر، یہ سمجھ کر کہ وہ بڑے دُور کی کوڑی لا رہا ہے، یہ کہے کہ "جناب وہ عرب تھا، یہ ہندوستان ہے وہاں ایک قوم آباد تھی، یہاں ستر ہزار قومیں بستی ہیں"۔

سب سے پہلا اعتراض تو اس بات پر ہی ہے کہ ہندوستان میں ستر ہزار یا متعدد قومیں بستی ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے، قوم تو یہاں بھی صرف ایک ہی بستی ہے جسے "ہندوستانی" کہتے ہیں۔ البتہ مذاہب مختلف ہیں، سو، عرب میں بھی مسلمانوں کے دوش بدوش بُت پرست موجود تھے اور مسلمان عورتیں اُن بُت پرستوں، اور منافقوں سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔

دوسرا اعتراض اس پر یہ وارد ہو سکتا ہے کہ جب آیاتِ حجاب کا نزول ہوا تھا، آیا خدائے بزرگ کے علم میں یہ بات تھی کہ اسلام عرب سے باہر بھی نکلے گا۔ مسلمان دوسری قوموں کے دوش بدوش بھی زندگی بسر کریں گے اور ۱۹۳۵ء میں آٹھ کروڑ مسلمان، محکوموں اور غلاموں کی طرح ہندوستان میں رہنے پر مجبور ہوں گے؟

اگر خدا کے علم میں یہ بات تھی، تو کیا ہندی عورتوں کے احکام حجاب کے بارے

میں اس سے بھول ہوگئی؟ اُس کے ذہن میں اتنی موٹی بات بھی نہ آئی کہ اسلامی پردہ ہندوستان میں کیونکر مقبول ہو سکیگا۔

اور جس وقت پیغمبر اسلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر دین کے "اکمل" اور نعمتوں کے تمام" ہوجانے کا بشدّومدّ اعلان فرمایا تھا، کیا حضور کے پیش نظر اُسوقت یہ بات نہ تھی کہ ہندی عورتوں کے پردے کے باب میں قرآن کے آیات حجاب تشنہ، غیر مکمل، اور ناتمام ہیں؟

مسلمانو! آؤ، تمہاری عبرت کے لئے تمہیں، تمہاری ہی بڑی بوڑھیوں کے تاریخی واقعات میں سے ایک واقعہ سناؤں۔ سُنو، اور عبرت کے کانوں سے سُنو۔ نہیں۔ پہلے قادسیہ کی جنگ کے میدان میں اپنی ایک شاعرہ کے ان اشعار کا ترجمہ سُن لو، جو اُس نے اپنے بچوں کو سُنائے تھے۔

"پیارے بیٹو! تم اپنے ملک پر بار نہ تھے کہ میں تمہیں آتشِ جنگ کا ایندھن بنانے لائی ہوں۔ تمہارے ملک میں قحط بھی نہیں پڑا تھا کہ میں تم سے سبکدوش ہونے کے لئے تمہیں جنگ کے شعلوں میں جھونک رہی ہوں۔ نہیں۔ اے پیارے بیٹو، ان میں سے کوئی بات نہیں، میں تمہیں جنگ کی طرف اِس لئے للکار رہی ہوں کہ یہ معاملہ ہے قومی غیرت وعزت کا، یہ معاملہ اسلام کی سربلندی کا، یہ معاملہ ہے رُوحِ عرب کی سرفرازی کا۔ خدا کی قسم جس طرح تم ایک ماں کے بیٹے ہو اسی طرح ایک ہی باپ کے فرزند بھی ہو، میں نے تمہارے باپ سے بددیانتی نہیں کی۔ نہ تمہارے ماموں کو رُسوا کیا۔ اے میرے چاروں بیٹو، آج معاوضے کا دن ہے۔ آج تم مجھ سے بھی بددیانتی نہ کرنا، اور مجھے بھی رُسوا کرنے سے احتراز کرنا۔"

مسلمانو! یہ بھڑکتی ہوئی آگ تھی، جو تمہارے مردوں ہی میں نہیں، تمہاری عورتوں تک کے سینے میں مشتعل رہا کرتی تھی، ذرا اپنی پردے میں بیٹھنے والی عورتوں کے سینے چاک کر کے دیکھو، کیا وہ بھی اِسی طرح مشتعل ہیں؟

ہاں تو جو واقعہ میں بیان کرنا چاہتا تھا، وہ بھی سُن لو۔ شاید تم کچھ سبق حاصل کر سکو۔

یہ عراق عرب کی جنگ کا واقعہ ہے۔ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی خاطر عیسائی، بحروبر سے آندھیوں اور طوفانوں کی طرح اُمڈے چلے آرہے تھے

خانقاہ نشین راہب، اور خلوت گزیں پادری بھی اپنے گوشوں سے نکل نکل کر عیسائی فوجوں میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے تھے۔ آدمیوں کا ایک بھرا ہوا سمندر تھا، جو مسلمانوں کے بیڑے کو غرق کر دینے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ مچل رہا تھا۔ موجیں مار رہا تھا۔

الغرض دیکھتے ہی دیکھتے ۲ دو لاکھ سے زیادہ رُومیوں کا جنگل، صرف تیس ہزار مسلمانوں کے سامنے آکھڑا ہوا۔ رُومی عربوں کی قلّت پر مسکرائے اور یہ خیال کیا، کہ شاید عرب دیوانے ہو گئے ہیں۔

آخر کار طبلِ جنگ پر چوب پڑی، آگ اور خون کے دیوتا نے انگڑائی لی۔ موت نے کروٹ بدلی ——— قتال کا بازار گرم ہو گیا، زمین، دریا کی موجوں کی طرح ہلنے لگی، تلواروں کی بجلیاں گرنے لگیں، اور سنسناتے ہوئے تیر دلوں میں ترازو ہونے لگے۔ مردوں کی جانیں، اور عورتوں کا سُہاگ لٹنے لگا۔ ———

رُومیوں کے جوش کا یہ عالم تھا گویا وقت کا پہیا ہیں جو کبھی پیچھے کی طرف گردش نہیں کرتا۔

اتنے میں پادری اور بشپ ہاتھوں میں صلیبیں لئے ہوئے مسیح کا نعرہ بلند کرتے ہوئے نمودار ہوئے اور ایک لمحے کے اندر رُومیوں نے اِس شدّت سے حملہ کر دیا کہ مسلمان پسپا ہونے لگے اور یہاں تک کہ اپنی عورتوں کے خیموں تک پہونچ گئے۔

——— یہ دیکھنا تھا کہ تمام عورتیں دفعتہً طیش میں آگئیں، اور خیموں کی چوبیں نکال نکال کر دیوانہ وار چلاّنے لگیں کہ اے عرب کے سپاہیو، اب اگر ایک قدم بھی پیچھے ہٹے تو خدا کی قسم انھیں چوبوں سے ہم تمہارے سروں کو پاش پاش کر دینگے، کچل ڈالیں گے۔"

لیکن اس اثنار میں رُومیوں کے ایک مزید قیامت ریز ریلے نے مسلمانوں کو چند قدم اور پیچھے دھکیل دیا ——— اب کیا تھا، آگ لگ گئی، اور تمام عورتیں دیوانی شیرنیوں کی طرح دشمنوں پر ٹوٹ پڑیں اور اس حیرتناک ولولے اور جوش کے ساتھ حملہ کیا کہ عیسائیوں کی پیش قدمیوں کی سانس دفعتہً رُک گئی، اور سراسیمہ ہو کر ان عورتوں کو دیکھنے لگے ——— اتنے میں بپھری ہوئی شیرنیوں نے اپنے مردوں کو پھر للکارا "اے عرب کے بہادر بچو! اے محمد عربی کے غلامو، اے خدائے بزرگ و برتر کے آخری پیغام کے حاملو! آگ اور خون کے دریا میں کود پڑو، مرجاؤ یا رُومیوں کو پیس ڈالو دیکھو خود رسُول اللہ کی رُوحِ مطہر تمہیں غور سے دیکھ رہی ہے"!

یہ سُننا تھا کہ مسلمانوں کے رگوں میں بجلیاں دوڑنے لگیں، اللّٰہُ اکبر کے نعروں کے ساتھ مُسلمان رُومیوں پر ٹوٹ پڑے سُورما عورتیں صفِ اوّلین سے پیچھے آگئیں اور پکار پکار کر کہنے لگیں " اے اسلام کے فرزندو، اے عرب کے سپوتو، اب ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے، اب اگر ایک انچ بھی تم جاری طرف کھسکے تو تمہیں قسم ہے خدائے

بزرگ و برتر کی کہ پھر زندگی بھر ہمارا مُنہ نہ دیکھنا۔ ہم تم پر حرام ہو جائیں گے"۔
اور اے مسلمانو! جانتے ہو تمہاری اِن بہادر عورتوں کی مردانگی کا نتیجہ کیا ہوا؟
مسلمانوں نے رُومیوں پر ایسی شاندار اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسی حیرتناک فتح
پائی کہ تاریخ آج تک انگشت بدنداں ہے۔

انصاف سے کہو کیا یہ پردہ نشین عورتوں کے کارنامے ہیں؟

اے دوستو! تمہاری عورتیں تو بھوتوں اور چڑیلوں کے تذکروں سے کانپتی ہیں
تمہاری عورتیں تو اپنی کہانیوں سے تمہارے بچوں تک کو بزدل بنا رہی ہیں۔ کیا تم انہیں
میدانِ جنگ میں لے جا سکتے ہو؟ کیا یہ طبلِ جنگ کی آواز سُنتے ہی" اُوئی، اُوئی" کر کے
بیہوش نہ ہو جائیں گی؟۔

کیا تم سمجھ رہے ہو اے بھولے بھالے مُسلمانو، کہ میں تم سے کیا مطالبہ کر رہا ہوں؟
آہ تمہاری عقلوں پر تو پردے پڑے ہوئے ہیں۔

کان کھول کر سنو، میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں، یورپ والیوں کی ریس
کرنے لگیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں ان کی طرح آزاد ہو جائیں۔
میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں مشرقی شرافت کو بالائے طاق رکھ کر مغربی
عشوہ گری اختیار کر لیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں ننڈلیاں، اور بانہیں عریاں
کر کے اونچی اونچی ایڑیوں پر کھٹکھٹاتی پھریں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں پریاں بنکر
لال دیو کے ساتھ، اُڑن کھٹولوں پر سوار ہو کر راجہ اِندر کے اکھاڑے میں اُترنے لگیں میں
نہیں چاہتا تمہاری عورتیں فانوسِ خلوت کے عوض شمعِ جلوت بن جائیں۔ اور میں یہ بھی
نہیں چاہتا کہ تمہاری عورتیں، یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے اپنے چہروں پر

مجتہدانہ خشکی پیدا کر لیں —— میرا تو تم سے صرف یہ خفیف سا مطالبہ ہے کہ اپنی عورتوں کو کھلی ہوئی ہوا میں سانس لینے کا موقع دو، انھیں اس طرح پردے میں گھونٹ کر نہ رکھو۔ انھیں باہر نکالو، انھیں اپنی تعلیم دو کہ وہ تدبیر منزل، اور تربیت اولاد کو سمجھنے لگیں۔ زندگی اور اس کے مقتضیات سے واقف ہو جائیں اور بس۔

میں کہوں گا، اور بار بار کہوں گا اپنی عورتوں سے تمہارا سلوک نہایت ہی ظالمانہ بلکہ وحشیانہ ہے، تم نے انھیں زندگی کے تمام حقوق سے یکسر محروم کر دیا ہے، تم نے ان سے وہ سب کچھ چھین لیا ہے، جو تمہارے خدا اور رسول نے انھیں بخشا تھا۔

اے مسلمانو! کیا تم نہیں دیکھتے کہ پردے کی وبا نے تمہاری عورتوں کی کیا درگت بنا رکھی ہے۔

کیا مُردہ اور بجھے ہوئے خون کی مائیں، تازہ اور شگفتہ بچے پیدا کر سکتی ہیں۔

کیا تم اپنے گھروں کی گندگی اور بدسلیقگی کو نہیں دیکھتے۔ کیا ایسے مکانوں کے مکیں، اور اس ماحول میں پروان چڑھنے والے بچے بلند خیالی اور شائستگی کا تصور تک کر سکتے ہیں۔

اے بھائیو، ذرا اپنی عورتوں کو غور سے دیکھو، کیا وہ زرد اور مدقوق نہیں ہیں؟ کیا ان کے جسم، ترس آنے کی حد تک لاغر نہیں ہیں؟ کیا ان کی پنڈلیاں اور ان کے بازو سوکھے ہوئے نہیں ہیں؟

خدارا ان مقید عورتوں کے ستے ہوئے، روکھے پھیکے، سیٹھے، اور زرد چہروں پر نگاہ ڈالو —— کیا تمہارے پردے نے انھیں تمام نسائی دلفریبیوں سے محروم نہیں کر دیا ہے،

ذرا اپنی عورتوں کی غیر فطری چالوں، گرتے ہوئے بالوں، ٹپکتی ہوئی کنپٹیوں اور اُڑتے ہوئے رنگ دیکھو۔ یہ لاغر تصویریں تمہارے ہی ہاتھ کی کھینچی ہوئی ہیں۔
آنکھیں اچھی طرح کھول کر دیکھو، کیا اس نامراد پردے کے باعث حسن و جمال تمہاری جماعت سے روز بروز مفقود ہوتا نہیں چلا جا رہا ہے؟ اور کیا مسلمان کا ذوقِ جمال، تنگ حجروں کی اور گندی مرطوب ہواؤں کے مارے ہوئے حُسن ہی پر قانع ہو جانے پر آمادہ ہو چکا ہے؟
اے جھوٹی غیرت کے جھوٹے ٹھیکیدارو! اے اپنی عورتوں کی جہالت، کمزوری، وہم پرستی، بزدلی اور بدصورتی پر فخر کرنے والے حاجیو، قادریو، اور حافظو! ذرا سینماؤں میں جاؤ، تھیٹروں کی سیر کرو، اور زنان بازاری کی خلوت گاہوں میں جھانک کر دیکھو۔ اِن تمام مقامات پر تمہیں ستر فیصدی مسلمان نظر آئیں گے۔
تمہیں خبر نہیں تمہارے پردے کے ذوق ہی نے اِن نوجوانوں کو یہاں بھیجا ہے
——— تمہیں اِن تمام بداخلاقیوں کے ذمّہ دار ہو۔
تم نے اپنی عورتوں کو پردوں میں گھونٹ کر اُنھیں اس قدر بیکار، غیر دلچسپ اور بدصورت بنا دیا ہے کہ شام ہوتے ہی تمہارے نوجوان گھروں سے رسّے تڑا کر بھاگ جاتے ہیں، اور وہاں پہونچ جاتے ہیں جہاں اُنھیں "سچ مچ کی عورتیں" مِل سکتی ہیں۔ جو خطرناک ہونے کے باوصف اُن کی جوانیوں کو اپنی دلچسپ باتوں اور اپنی ٹھنڈی ہوا کے پالے ہوئے سُرخ رخساروں سے آسودہ کر سکتی ہیں۔
یاد رکھو کاغذ کے مصنوعی پھول، اصلی پھولوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے، اور بہتے ہوئے پانی پر، ٹھہرے ہوئے پانی کو صرف وہی لوگ ترجیح دے سکتے ہیں، جن کی کھوپڑیوں کا گودا خشک ہو چکا ہے ——— کیا تم نے نہیں سُنا؟

که بوئے فساد کی آتی ہے بند پانی سے

عید

آج بقر عید کا دن ہے، صبح کے آٹھ بجے ہیں، دہلی میں ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں —— عید گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے، شانوں سے شانے چھل رہے ہیں۔ گرد ہے۔ غبار ہے، ہجوم ہے، ہنگامہ ہے ——"

تانگوں اور موٹروں کا عالم ہے گویا سمندر کی موجیں بلند ہوتی ہوئی چلی آرہی ہیں۔

ہر طرف ریل پیل ہے، شور و غوغا ہے، دھکم دھکا ہے، چہچہے ہیں، قہقہے ہیں —— مگر ایک شخص، جو دور سے اس منظر کو دیکھ رہا ہے، وہ خاموش ہے، ساکت ہے، مغموم ہے ضبط سے سینے میں گھٹی ہوئی ہچکیاں اُس کا گلا روندے ہوئے ہیں

وہ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی عید کا تصوّر کر رہا ہے، اُس کی نگاہیں لال قلعے پر ہیں —— وہ لال قلعہ جس کے منہ پر اب خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں۔

آج سے ڈیڑھ سو برس بیشتر کی عید —— توپوں کی دندناہٹیں، جلاجل کی جھن جھناہٹیں، گھوڑوں کی چہل پہل، ہاتھیوں کی قطاریں۔ پرچموں کی لہریں۔ جلوس کے طنطنے۔ فوجوں کی صفیں —— زر و گوہر کی بارشیں، انعام و اکرام کے غلغلے، نقیبوں کی آوازیں، اور شادیانوں کی دھومیں —— کیا سب ختم ہو گیا؟ کیا سب خواب تھا؟

وہ جاہ و جلال کا تناور درخت، جس کی جڑیں گاؤ زمین تک پہنچی ہوئی تھیں اور وہ

عظمت وجبروت کا فلک بوس پہاڑ جس کی چوٹی ثریا سے سرگوشیاں کرتی تھی۔

کیا وہ درخت سُوکھ گیا؟ کیا وہ پہاڑ شق ہو گیا؟"

کیا یہ سب ایک خواب تھا؟ کیا یہ سب کچھ ایک افسانہ تھا؟"

ہاں سب کچھ ختم ہو گیا ——— خواب ہو گیا ——— افسانہ بن گیا

آخر بتاؤ کیوں، اور کیونکر؟

یہ داستان بہت تلخ ہے ——— اور خطرناک بھی۔

زمانہ ہونٹوں پر قفل لگا چکا ہے۔ اور دنیا قلموں کو توڑ چکی ہے۔ کہا جائے تو کیونکر، اور لکھا جائے تو کس طرح؟

سچی بات تم کس قدر تلخ ہوا کرتی ہو ——— اگر سچائی شہد کے سامنے پیش کر دی جائے، تو اس کا منہ بھی کڑوا ہو جائے۔

ہاں یہ "کیوں" اور "کیوں کر" ہندوستان کی "انفرادیت" سے پوچھو، شاید وہ کوئی ذمہ دارانہ جواب دے سکے۔

ہندوستان کی مُسلّمہ انفرادیت سے سوال کرو کہ یہاں کے باشندوں کے دماغوں میں مجموعی مفاد اور قومی مصالح کا کوئی "تصوّر" کبھی قائم ہوا ہے؟

کیا واقعی یہاں "میں صرف اپنے لئے جیتا ہوں" کے علاوہ بھی کچھ اور سوچا گیا ہے؟"

ہماری شدید و بے پرواہ "انفرادیت" سے "قوم" کے معنی پوچھو، وہ کہے گی۔ "شیخ" "سیّد"، "سکینہ"، اور "اگروال" اور بس۔

میں صرف اپنے لئے ہوں، ملک و قوم کا روگ میرے بس کا نہیں، اگر تمام ملک و قوم کو تباہ کر کے میں دولت کا ایک ذخیرہ، یا خطاب کے دو حروف حاصل کر سکتا ہوں

تو ملک و قوم کو تباہ کر دینے کی سعی سے مجھے دنیا کی کونسی قوت باز رکھ سکتی ہے؟"

ہاں یہی خیالات، اور یہی اصول ——— انفرادیت، اور اس شدت کے ساتھ انفرادیت! العظمتہ للہ!

ہر حلقہ، اپنی ایک مستقل دنیا رکھتا ہے اور دوسرے حلقے سے مس ہونا تک گوارا نہیں کرتا ——— زنجیر بنے تو کیونکر؟ مشین کے تمام پرزے صرف اپنے ہی کو دیکھ رہے ہیں، ایک دوسرے سے تعاون پر کسی طرح آمادہ نہیں مشین چلے تو کس طرح چلے؟

"انفرادیت" ——— "انفرادیت" "انفرادیت"

اے انفرادیت تو ہمارے تاج و تخت کو کھا چکی ہے، اب کیا ہماری ہڈیوں پر بھی تیری نظر ہے؟

کہتے ہیں قیامت کے دن ہر شخص "نفسی نفسی" پکارتا نظر آئیگا۔ یہ "نفسی نفسی" والی قیامت تو مدت ہوئی ہمارے سر سے گزر چکی ہے "گزر چکی ہے" کیا واقعی "گزر چکی ہے"

بندۂ خدا یہ کیوں نہیں کہتا کہ "اب بھی گزر رہی ہے؟" یہاں تو صدیوں سے میدان حشر گرم ہے اور "نفسی نفسی" کی صدائیں فضا میں گونج رہی ہیں۔

ہندو مشرق کی طرف بھاگ رہا ہے، اور مسلمان مغرب کی جانب یہیں تک نہیں۔ یہ پھر بھی غنیمت ہوتا، یہاں تو ہندو ہندو سے اور مسلمان مسلمان سے ٹکرا رہا ہے، ——— یہاں تو سناتن دھرمیوں اور آریہ سماجیوں میں کشتیاں ہو رہی ہیں۔

یہاں تو سنیوں اور شیعوں میں پینترے بدلے جا رہے ہیں ——— احمدیوں اور حنفیوں میں گھونسے چل رہے ہیں ———"

دنیا ہوائی جہازوں پر اُڑ رہی ہے، اور ہم عمیق غاروں کی دَلدل میں پھنسے ہوئے ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھال رہے ہیں۔

اِن حالات میں اُمید قائم کی جائے تو کِس طرح، اور آس لگائی جائے تو کیوں کر؟

اے خدائے مغربین و مشرقین، اگر تو محض ایک وہم انسانی نہیں ہے تو دیکھ اور ترس کھاتے ہوئے دیکھ کہ ہم تمام ہندوستانی، اپنی اپنی مذہبی کتابوں کے پُلندے سروں پر لادے ہوئے صدیوں سے تیرے اِس میدانِ حشر یعنی ہندوستان میں کھڑے ہوئے ہیں لیکن ہمارا فیصلہ نہ آج ہوتا ہے، نہ کل۔ کیا ہمارے اعمال نامے اتنے طویل ہیں کہ اُن کے کھولنے میں صدیاں لپٹ جاتی ہیں؟

نہیں اے پروردگارِ عالم نہیں —— پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے، اور مُخالف تھپیڑوں سے ہماری ہڈیاں ٹوٹی جا رہی ہیں —— کب تک یہ رُوح فرسا کشمکش تا کے یہ موت سے بدتر اُمید و بیم؟

اے خالقِ ارض و سما، اگر تو واقعی سمیع و بصیر، دانا و بینا، اور رحیم و کریم ہے تو ہمارا فیصلہ کر۔ جلد تر فیصلہ کر۔

ہماری بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑ کر ایک ایسی مضبوط زنجیر بنا دے کہ اگر دو پہاڑوں میں بھی رَسّہ کشی ہونے لگے تب بھی وہ زنجیر نہ ٹوٹ سکے۔

آخر ہم بھی انسان ہیں، اور دُوسرے مُلکوں کے انسانوں کی طرح ہمیں بھی جینے کا حق حاصل ہے۔

اور یہ یہ تیری مصلحت، یا اقتدار سے باہر ہے تو اے طُوفانِ نوح کے خُدا، اے

فرعون و شداد کے پروردگار! دیکھ یہ سامنے تیرا دہکتا ہوا اُمیدوں کو جلا کر خاک کر دینے والا
جہنّم ہے — جھونک دے، ہاں اس دہکتے ہوئے جہنم میں جھونک دے ہم
تمام گناہگار ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں — شیعوں، سُنّیوں — سناتن دھرمیوں
اور آریوں کو — جھونک دے، اور جلد جھونک دے — اس بھڑکتے ہوئے جہنم میں
اے طوفانِ نوح کے خدا، اور فرعون و شدّاد کے پروردگار!

آہ! تیری رحمت کے دعوے!

چیست کہ من بخوں تپم، واز تو سخن رود کہ تو
اشک، بدیدہ بشمری، نالہ بہ سینہ بنگری!

ہمارے شاعر

ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں جہاں "شعرائے کرام" یا بہ الفاظ دیگر "متغزلین" پائے جاتے ہیں، وہاں بلا استثنا یہ دیکھا جاتا ہے کہ اُن کے درمیان شدید عناد اور سخت دشمنی ہوتی ہے۔ مشاعروں کی شرکت کے سلسلے میں یہ شرطیں کی جاتی ہیں کہ اگر فلاں دائرہ ادب کو دعوت دی جائے گی تو ہم شریک نہ ہو سکیں گے۔ اور یہ دشمنیاں بالکل اُسی نوعیت کی ہوتی ہیں جیسی مُقدس اہلِ مذاہب و ادیان کے درمیان پائی جاتی ہیں۔

اِن دشمنیوں اور نفرتوں کی بنیاد محض اتنی سی بات پر ہوتی ہے کہ فلاں شخص، شاعر، یا گروہ میری شاعری کا معترف نہیں ہے، اور فلاں موقع پر فلاں شخص نے میری فلاں بندش پر اعتراض کیا تھا، اور فلاں شاعر نے فلاں مشاعرے میں مجھے حسبِ مراد داد نہیں دی تھی۔

میں پوچھتا ہوں کیا شاعروں کی فطرت ایسی ہی ہوتی ہے؟ کیا حقیقی شاعر اتنا کم ظرف، تنگدل، کینہ پرور، اور اوچھا ہو سکتا ہے؟

یہ ایک مُسلّم حقیقت ہے کہ اگر دماغ رسیدہ اور دل پگھلا ہوا نہ ہو تو انسان کا شاعر ہونا امکان سے خارج، بالغ دماغ، اور گداختہ دل کی موجودگی میں کیا کسی کی یہ مجال بھی ہے

وہ کسی سے نفرت یا عداوت کر سکے؟

نفرت و عداوت تو وہ مردار خوار پرندے ہیں جو سڑے ہوئے دماغوں اور گلے ہوئے دلوں پر منڈلایا کرتے ہیں۔

جب ہم گدوں کو کسی جگہ منڈلاتے دیکھتے ہیں تو ہمیں اُس مقام پر غلاظت کے جمع ہونے کا یقین ہو جاتا ہے ــــ اس طرح جب ہم کسی کے دل و دماغ کو نفرت و عداوت کا آشیاں پاتے ہیں تو ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اُس کے دل و دماغ سڑ چکے ہیں اور کیا یہ ایک لمحے کے واسطے بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ اس قدر ناپاک دل و دماغ میں شعر کی دیوی اپنا مسکن بنا سکے گی؟

شعر، گلاب کی سی حقیر شے نہیں ہے، جو گھورے پر بھی پیدا ہو سکتا ہے ــــ شعر کی بُنیاد تو لامحدود اور عالمگیر محبّت ہے ــــ جب دل میں محبت اپنے نقطۂ کمال تک پہونچ جاتی ہے۔ اس وقت شعر شروع ہوتا ہے، اور جب اپنے قاتل دشمن کی اداؤں پر بھی پیار آنے لگتا ہے۔ اُس وقت قلبِ انسانی میں شعر کی تخلیق ہونے لگتی ہے ـــــــــــ

شعر ایک ازلی عکس ہے ــــــ کیا مُکدّر آئینہ عکس قبول کر سکتا ہے؟ پیمبر و شاعر دونوں ایک ہی رُوحانی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ کیا کسی کے پیمبر کے متعلق کبھی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی فرد یا گروہ سے نفرت کرتا اور ذاتیات کی بناء پر عداوتیں پالا کرتا تھا؟ اس طرح میں دریافت کروں گا کہ کیا کسی شاعر کے اختیار میں یہ بات ہے کہ وہ کسی سے نفرت کرے، یا کسی کی عداوت دل میں پال سکے؟

اور اگر "شعراء" میں آپ یہ مشاہدہ کریں کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں، ایک دوسرے

کی غیبت کرتے ہیں، ایکدوسرے کے خلاف مضمون لکھتے اور لکھواتے ہیں۔ تو آپ اس موقع پر کیا فیصلہ کریں گے؟

شاعر کی سیرت مانتے ہوئے اُصول ڈالیں گے؟ یا ایسے "شعراء" کے "شاعر ہونے سے قطعی انکار کردیں گے؟

اب بات کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"شعرائے کرام" کی گنجان آبادی میں تمام لڑائیاں صرف اس بنیاد پر ہیں کہ فلاں ہماری شاعری کا مداح نہیں ہے، اور فلاں ہمارے اشعار کو پسند نہیں کرتا؟

یہ تو ایک "معلوم عوام" حدتک مانی ہوئی بات ہے کہ شعر سراسر ایک ذوقی اور وجدانی شئے ہے۔ یہ کوئی مادی چیز تو ہے نہیں کہ ہم اسے چکھ یا چُھو سکیں ——— یہ کوئی نگینہ بھی نہیں ہے کہ کانٹے میں رکھا اور پل بھر میں وزن معلوم کرلیا۔

شعر کا تو تمامتر انحصار، سامع کے ذوق اور وجدان پر ہوتا ہے، اور کیا ہر فرد کا وجدان اور ذوق ایک ہی نوعیت کا ہوتا ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو برائے خدا و رسول دوسروں کو موقعے دیجئے کہ وہ آپ کے شعر ناپسند بھی کریں۔

اگر غلطی کا وجود خود ہمارے شعر کے اندر ہے تو پھر بُرا ماننے کی کوئی بات ہی نہیں ——— اور اگر غلطی، سامع کے ذوق و وجدان کے اندر موجود ہے، تو پھر اس میں بیچارے سامع کا قصور ہی کیا ہے؟

کیا ہماری شاعری کا مُنکر محض اُس قدرت کے عطا کیے ہوئے ذوق کی بناء پر جو ہمارے ذوق سے متضاد واقع ہوا ہے، اس قابل ہے کہ وہ ہمارے تیروں کا ہدف اور ہماری ملامتوں کا نشانہ ہے؟

ایک صاحب تھے جنھیں آم کے نام سے متلی ہونے لگتی تھی، تو کیا آموں کے عاشق مرزا غالب کو محض اُن صاحب کی آم سے اس فطری نفرت کی بنا پر یہ لائسنس دیا جا سکتا تھا کہ وہ اُس کا گھر کھدوا کر پھینک دیں؟

حقائق سے کتنی بے پایاں ناواقفیت، اور نفسیات سے کیسی لا محدود بیگانگی ہے کہ میں کسی شخص سے صرف اس بنا پر نفرت کرنے لگوں کہ وہ مجھے اچھا شاعر ہی نہیں سمجھتا۔

یہ کیسی مضحکہ خیز جاہلانہ زبردستی ہے کہ صاحب ہمیں شاعر مانو، نہیں تو ہم آپکی اور اپنی جان ایک کر دیں گے۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ قدرت نے روزِ ازل تمام انسانوں کے ذوقِ ادب کو میری شاعری کی پسندیدگی کے سانچے میں ڈھالا تھا، اور جو شخص مجھے پسند نہیں کرتا وہ اپنی فطرت اور میری شاعری کا باغی ہے اور ظاہر ہے کہ بغاوت کی سزا موت سے کیا کم ہو سکتی ہے؟

ہمارے مجتہد

تھوڑے دن ہوئے کہ میں ایک مجتہد العصر کی زیارت کے لئے اُن کے دولتکدے پر گیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ برآمدے میں چند ترس آنے کی حد تک دُبلے پتلے مومنین، مرعوبیت و انتظار کی فضا میں بیٹھے ہوئے اونگھ رہے ہیں۔

میں بھی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دُبلے مومنوں نے مجھے اس طرح دیکھنا شروع کیا گویا وہ چاندنی رات میں کسی دور کی شئے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کامل آدھ گھنٹے کے انتظار کی اُلجھی ہوئی گرم سانسوں کے بعد یکایک نعرۂ "صلوٰۃ" بلند ہوا۔ اب جو نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ مجتہد صاحب آنکھوں کو جھکائے اور جسم کو چرائے ہوئے اس طرح چلے آرہے ہیں گویا آدھی رات کی تاریکی میں کوئی سہمی ہوئی سازش حرکت کر رہی ہے۔

میں نے بڑھ کر سلام کیا، جس کا اِس طرح جواب دیا گیا، جس طرح ہندوستانی لڑکیاں ایجاب و قبول کے وقت "ہوں" کرتی ہیں، میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا قبلہ و کعبہ نے اپنی انگوٹھیوں سے آراستہ اُنگلیوں کی نوکوں کو میری اُنگلیوں سے بعجلت تمام مس کر کے فوراً ہات کھینچ لیا، میری انگلیوں کو مس وہ بالکل ایسا معلوم ہوا گویا خواب میں کسی دیوی کا آنچل ہوا دیتا ہوا نکل گیا۔

اتنے میں ایک دیہاتی وضع کے موٹے تازے بزرگ، جن کی سیڑھیوں پر چڑھنے سے سانس چڑھ رہی تھی اور مونچھوں کے پولے لہلہا رہے تھے، گھبرائے ہوئے آئے اور بغیر دم لئے ہوئے جیب سے ایک پرچہ نکال کر قبلہ وکعبہ کی جانب بڑھا دیا "حضور اس پر دستخط فرما دیں"۔

دیہاتی مومن کی اس خلافِ آداب عجلت پسندی پر تمدن کے آغوش کا پلا ہوا اور معتقدین کی پابوسیوں کا پروان چڑھایا ہوا اجتہاد چیں بجبیں ہو گیا بگڑ گیا۔ تیوریوں میں بل پڑ گئے، اور "مجھے اس وقت فرصت نہیں ہے" کا انتقامی جواب دیکر قبلہ وکعبہ نے منہ پھیر لیا۔ اور اس برہم ہو کر منہ پھیر لینے نے غیر ملفوظ طور پر کہا "دیہاتی، بدتمیز۔ اُجڈ۔ گنوار"۔

لیکن دیہاتی مومن دھن کا پکا، اور عقیدت میں راسخ تھا، اس کا پرچہ والا ہاتھ قبلہ وکعبہ کی جانب بلند ہی رہا، "آپ پرچہ لے جائیں"۔

مجتہد العصر نے پھر جھڑک کر کہا۔ "حضور! میری گاڑی میں صرف دو گھنٹے باقی ہیں اور کام اس قدر ضروری ہے کہ میں ٹھہر بھی نہیں سکتا ہوں، قبلہ وکعبہ کی بڑی پرورش ہوگی اگر اس پرچے پر اس وقت دستخط کر دیں"۔ دیہاتی مومن نے بڑی لجاجت سے عرض کیا "ملائیے، پرچہ لائیے، وقت ناوقت لوگ پریشان کیا کرتے ہیں"۔ قبلہ وکعبہ نے یہ کہہ کر پرچہ دستِ مبارک میں لے کر پڑھنا شروع کیا، پرچہ پڑھنے کے وقت قبلہ وکعبہ کا چہرہ مئی جون کے آسمان کی طرح تُرد کھا اور نکھرا ہو رہا تھا۔ اور آسمان سے آواز آ رہی تھی "اخاہ رے ماؤ رے"، پرچہ پڑھ کر قلم اُٹھایا اتنے زور سے دستخط کئے کہ روشنائی کی چھینٹیں دور دور تک پھیل گئیں، اور صریرِ قلم سے سب وشتم کی آوازیں آنے لگیں۔

"لیجئے" ترازوئے غیض میں تلی ہوئی آواز کے ساتھ مجتہد العصر نے دستخط کر کے پرچہ ان کی طرف پھینک دیا بغیر مہر کا پرچہ دیکھتے ہی حضور مہر مہر کی گھبرائی ہوئی آواز دیہاتی مومن کے گلے سے نکلی۔ اور اس آواز کے سنتے ہی قبلہ و کعبہ نے اپنے ملازم کو گرج کر صدا دی" مہر لاؤ، مہر لاؤ"۔ مہر لاؤ، مہر لاؤ" کے لہجے میں وہی گونج تھی جو کھوکھلا امیروں کی "کوئی ہے" کی فرعونی آواز میں پائی جاتی ہے۔ ملازم نے وحشت زدہ ہو کر مہر پیش کر دی، گھبراہٹ اور خوف سے اس غریب کے مرتب ٹپے اسپنج کی طرح پھول کر رہ گئے۔

قبلہ و کعبہ نے کاغذ پر ثبت فرمانے کے لئے مہر بلند کی اس انداز سے گویا کسی کافر کا سر کچلنے والے ہیں۔ اٹھے ہوئے ہاتھ کے انگوٹھیوں کے فیروزے چمکے، مہر لگنے کی دھم سے مہیب آواز آئی — دیہاتی مومن اچھل پڑا — مہر ثبت فرما دی گئی، اور ثبت کرتے ہی بیچارہ کو ترٹے سے دور سے پھینک دیا گیا۔

یہ ہے ہمارے مجتہدین کرام کا اخلاق — یہ ہے ان مقدس ہستیوں کا عقیدتمند مسلمانوں سے برتاؤ، جو اپنے کو انبیائے بنی اسرائیل کا ہمپایہ سمجھتے ہیں۔

اور یہ ہے آپ کے "علمائے کرام" کا کروفر، آپ کے "حامیان دین متین" کا دبدبہ، اور آپ کے "شمس العلماؤں" کا طنطنہ؟

اور یہ بھی غور کیجئے کہ یہ فرعونیت کا مظاہرہ کس مقام معصومیت سے کیا جاتا ہے؟ بساط ائمہؑ، اور مسند رسولؐ سے! کون ائمہؑ، اور کون رسولؐ؟ وہ ائمہؑ، جو سلام میں سبقت کرنے والے، سب و شتم کا جواب احسان سے دینے والے، منہ پر تھوک دینے والے کے سینے سے اتر آنے والے، اور اپنے قاتل کو شربت پلانے والے تھے۔

اور وہ رسول جو صاحب خلقِ عظیم اور رحمۃ اللعلمین تھا۔ وہ رسول جس نے حکم دیا ہے کہ سائل کو بھی نہ جھڑکا جائے، اور وہ رسول، جس نے کفاروں کی نجاست اپنے مقدس ہاتھوں سے صاف کی تھی۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

شکایت کی جاتی ہے مغربی تہذیب، مغربی ثقافت اور مغربی لٹریچر سے کہ یہ ہمارے نوجوانوں کو ملحد و کافر بنا رہا ہے۔ حالانکہ دنیا اور بالخصوص بھولے بھالے مقلد قسم کے مسلمانوں کو اس کا علم نہیں ہے کہ ان خطاب یافتہ مولویوں، ان حکومت گزیدہ مجتہدوں اور ان قوالی زدہ پیروں کی ہر سانس ایک زبردست دار الضرب ہے۔ جہاں آئے دن ارتداد و الحاد کے لاکھوں سکے ڈھلا کرتے ہیں۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با ما ہر چہ کرد آں آشنا کرد

ہمارے پیر

یہ دیکھئے ایک پیر صاحب خانقاہ کے احاطے میں بیٹھے قوالی سن رہے ہیں۔ کالی بھونرا سی لٹوں میں تیل رینگ رہا ہے، ہونٹھ میں گلوری، اور گلوری میں قوام مہک رہا ہے۔ عبا سبز رنگ کی ہے، تسبیح سرخ ہے، اور جانمازی کا عصا سامنے رکھا ہوا ہے۔ جس کے پاس ہی ایک تھالی میں گلوریاں، اور دوسری میں پھول رکھے ہوئے ہیں۔

مریدوں کا ہجوم ہے۔ مشتاقانِ زیارت کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔ کچھ بیٹھے ہیں۔ کھڑے ہوئے لوگوں میں ہلچل ہے۔ کوئی کسی کے کاندھے پر جھکا ہوا ہے۔ کوئی کسی کی بغل سے جھانک رہا ہے اور کوئی کہنیاں مار مار کر اندر آنا چاہتا ہے۔ بیٹھے ہوؤں میں کوئی تو کسی کے گھٹنے پر گھٹنا اس زور سے رکھے ہوئے ہے کہ اس کی قوالی کا تمام مزا کرکرا ہو رہا ہے۔ اور کسی کے بغل میں دبے ہوئے جوتوں سے کڑوے تیل کی اس قدر بدبو آرہی ہے کہ پاس والوں کی ناکیں سڑی جاتی ہیں۔ اور کوئی اس طرح جھوم رہا ہے کہ دوسروں کے سروں میں ٹکریں لگ رہی ہیں ——— البتہ بازاری عورتیں نسبتاً آرام سے بیٹھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ انہیں جوارِ پیری میں جگہ دی گئی ہے اور ان سے آنکھیں لڑا لڑا کر روحانیت کی نبضوں میں خون دوڑایا جا رہا ہے۔

تالیوں کے ساتھ "آہ، وا" کی بلبلادینے والی صدائیں ایسی ہیں کہ بڑی بڑی داڑھیوں

والے بوڑھوں کے مونڈھے رقص کرنے کے لئے ہلے چلے جاتے ہیں۔

دھوتیاں باندھے ہوئے مُرید ہر "آرے آرے می کنم" کی آواز پر جس کے معنی وہ بالکل نہیں سمجھتے لانبے لانبے ڈگ رکھتے ہوئے پیر کے سامنے آآ کر نذریں پیش کر رہے ہیں کہ اتنے میں ایک نہایت بھدّا تُندیل ادھیڑ آدمی، جس کی صورت ناریل سے ملتی ہوئی ہے یکایک ایک چیخ مارتا ہے، اور کھڑا ہو کر تھرکنے لگتا ہے "آرے آرے می کنم، آرے آرے می کنم، ہاں آرے آرے می کنم، "آرے آرے می کنم"، کا ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے اور تمام محفل اُچھل کود میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

مرید چیخیں مار مار کر پیر کو نذریں دینے لگتے ہیں۔ دو روپے کی نذر والے سے پیر صرف مصافحہ کرتا ہے اور چار روپے والے کے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے اور چیخیں مار مار کر جھولنے لگتا ہے۔

یہ ہے اسلامی تہذیب کا مظاہرہ، اور یہ ہے اسلام کی روحانیت کا اعلان ——
ڈنکے کی چوٹ پر اعلان، چیخیں مارتا، ناچتا، تالیاں بجاتا اور تھرکتا ہوا اعلان:-
شکایت کی جاتی ہے کہ ہم مظلوم ہیں۔ بے دست و پا ہیں۔ مفتوح ہیں تو کیا تم سارنگیوں کی روں روں، اور تالیوں کی چٹاچٹ اور "آہے وا" کی گونج میں ممالک عالم کو مسخر کرنا چاہتے ہو؟ کیوں نہ ہو اے ناچنے والو سور ماؤ!

الفاظ اور شاعر

الفاظ کو کاغذ پر روشنائی کی لکیریں نہ سمجھو، وہ نہ تو بے جان لکیریں ہیں، نہ ہوا کی گرہیں۔

الفاظ تو ذی حیات ہیں، انسانوں کی روحِ ذی حیات۔

الفاظ بھی آدمیوں ہی کی طرح پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، بیمار پڑتے اور تندرست ہوتے ہیں۔ بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ گوشہ نشین رہتے اور سفر کرتے ہیں۔ یہ بھی اپنے اپنے خاص مزاج، عادات، رسوم، روایات اور تاریخی واقعات رکھتے ہیں۔ ان کی دنیا میں بھی ذات پات اور مذہب و معاشرت کا رواج ہے۔ یہ بھی انجمنیں اور سوسائیٹیاں بنا کر رہتے اور ترقی کے مدارج سے انھیں بھی گذرنا پڑتا ہے۔

ان میں بھی مختلف نسلیں، خاندان اور شجرے ہوتے ہیں، اور ہر خاندان اپنے ہی عزیزوں اور کُفُو میں شادی کرتا ہے۔

الفاظ پر بھی لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کی فضائیں آتی ہیں۔ ان میں بھی بعض تو ہم انسانوں کی طرح نیکنام ہوتے ہیں۔ اور بعض بدنام۔ بعض عبائیں پہنے ہوئے دیوتاؤں کے مندروں میں رہتے ہیں، بعض دستاریں زیب سر کئے ہوئے درباروں میں اور بعض ننگے پاؤں بازاروں میں مارے مارے پھرتے ہیں، بعض کے ہات پاؤں چومے

جاتے ہیں۔ اور بعض جب دروازے پر آتے ہیں تو انہیں دھتکار دیا جاتا ہے۔ ان میں متقی و پرہیز گار بھی ہوتے ہیں۔ اور آزاد و خراباتی بھی۔ ان میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی، متوسطین کا طبقہ ان میں بھی اہمیت رکھتا ہے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔

الفاظ میں بھی ہم انسانوں کی طرح بعض الفاظ انتہا درجہ کے شریف، رقیق القلب اور بردبار ہوتے ہیں۔ اور بعض پرلے درجہ کے مفسد، سفاک اور دل آزار۔ ان میں سے بعض تو باغی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور بعض چپراسی ذہنیت کے، بعض بزم کے رسیا ہوتے ہیں اور بعض رزم کے مردِ میدان بعض کی کمروں پر تو لمبے پرتلوں کی تلواریں لٹکی رہتی ہیں اور بعض کے گلے میں پھولوں کی بدھیاں اور کان میں سونے کے دُر پہنتے ہیں۔

لیکن تمام الفاظ میں یہ ایک عجیب مشترک و عمومی خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ بے ہمہ و باہمہ رہنا ہی پسند کرتے ہیں ملتے تو سب سے ہیں مگر اپنے کو لئے دیئے ہوئے۔ معلوم نہیں یہ شرمیلے ہوتے ہیں کہ مغرور۔ مگر ان سب کی یہ ایک عادت ہے کہ جلد بے تکلف ہو جانے کو بہت ہی بُرا سمجھتے ہیں اور دیر آشنائی پر کاربند رہتے ہیں۔

آدمی کے حافظے کی کمزوری، یا درس و تدریس کے شوق نے نہایت ہی گستاخی کے ساتھ انہیں لغات کی نمائشی الماریوں میں سجا دیا ہے۔ یہ ان الماریوں میں طوعاً کرہاً بیٹھے تو ہیں، مگر بڑی چالاکی کے ساتھ انھوں نے اپنے چہروں پر نقابیں ڈال رکھی ہیں تاکہ انہیں بہ آسانی پہچانا نہ جا سکے اور مکمل خط و خال تو کبھی نمایاں ہی نہ ہو سکیں۔

جب تک کوئی اللہ کا بندہ ان کے پیچھے نہ پڑ جائے، ان کی گلیوں کی خاک نہ

چھان ڈالے، مہینوں نہیں برسوں ان سے ملے جلے نہ، ان کی میزبانی نہ کرے۔ ان کے گھر مہمان نہ رہے، سالہا سال تک ان کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھے ان کی غمی شادی میں شریک نہ ہو، ان سے رشتہ ناتا نہ جوڑے۔ ان کی نبضوں کی رفتار۔ ان کے خون کی گردش اور ان کے خاندانی و ذاتی خصوصیات کو نہ پرکھ لے، اس وقت تک یہ مغرور یا شرمیلے الفاظ اس سے بے تکلف نہیں ہوتے، اور اسے اپنے مزاج کی افتاد اور اپنے اسرار سے آگاہ کرنا پسند نہیں کرتے۔

انسانوں کے بے شمار طبقوں میں سے صرف ادیبوں اور شاعروں کے دو ایسے طبقے ہیں جن سے ان کی بے تکلفانہ رسم و راہ اور مخلصانہ دوستی ہے۔

ادیبوں سے ہر چند ان کی ملاقات دوستانہ اور مخلصانہ ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے گھر اکثر آیا جایا بھی کرتے ہیں لیکن بعض نازک مزاج، اسرار پسند اور نغمہ پرور اونچے گھرانوں کے الفاظ ان سے کھل کھیلنا اور خار ملار کھنا پسند نہیں کرتے، وہ اگر ادیبوں کے سامنے آتے بھی ہیں تو ان شوخ و شنگ لڑکیوں کی طرح جو دور سے تو خوب لگاوٹ دکھاتی ہیں لیکن جب اُن کا دامن پکڑنے کے لیے لپکو تو انگلیاں چمکاتی اور قہقہے مارتی ہوئی الٹے پاؤں بھاگ جاتی ہیں۔

البتہ شاعروں کے ساتھ ان کا برتاؤ دوستوں ہی کا سا نہیں، قرابت داروں کا سا ہوتا ہے۔ وہ شاعروں سے اس طرح ملتے جلتے ہیں جیسے ایک ہی گھر کے مختلف افراد یا ساتھ کھیلے ہوئے لنگوٹیا یار۔

شاعروں کو انھوں نے یہاں تک اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہیں ان کے لباس تبدیل کر دیں۔ ان کی لے اور رنگ بدل دیں۔ ان کا رُخ موڑ دیں۔ ان کے

معنوں میں تنگی یا وسعت پیدا کردیں۔ اور ان کے خط و خال میں کمی بیشی فرمادیں۔ شاعر سے ان کے گھروں کی عورتیں بلکہ کنواریاں تک پردہ نہیں کرتیں۔ وہ جب چاہے دوپہر ہو یا آدھی رات بے دھڑک ان کے گھروں اور ان کی خوابگاہوں میں آجا سکتا ہے۔

شاعر کے سامنے آتے ہی ہر نسل اور ہر مزاج کے الفاظ اپنی نسلوں اور مزاجوں کا جھگڑا بھول جاتے ہیں، ذات، پات، اور رنگ و مذہب کی کوئی آویزش باقی نہیں رہتی وہ سب ایک ہی تھالی میں کھاتے، ایک ہی کوزے میں پیتے اور ایک ہی حلقے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ شاعر کا مکان الفاظ کی عبادتگاہ ہے۔ جہاں ادنیٰ و اعلیٰ اور شاہ گدا ہر قسم کے الفاظ ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں اور صفوں میں ایسی شائستگی ہوتی ہے جیسے راگنی کے بولوں میں ہم آہنگی۔

اکثر اوقات روحانی لمحوں اور وجدانی ساعتوں میں جبکہ شاعر کے احساسات انگڑائی پر انگڑائیاں لینے لگتے ہیں، الفاظ کی ٹولیوں کی ٹولیاں جن میں بوڑھے، جوان، لڑکے اور لڑکیاں سبھی ہوتے ہیں۔ شاعر کے پاس ہواؤں کے دوش پر آتے ہیں اور اس کی معنویت کے گرد حلقہ باندھ کر اس طرح ناچتے اور گاتے ہیں کہ کبھی تو ماہی سے ماہ تک تبسم ہی تبسم جھلکنے لگتا ہے اور کبھی ذروں سے لیکر ستاروں تک آنسو ہی آنسو نظر آتے ہیں۔

اُمرائے ہند

ہندوستان کے امرا سے اربابِ فکر کو ہمیشہ یہ بجا شکایت رہی ہے کہ وہ اپنی قوم کی خدمت کا کبھی خواب تک نہیں دیکھتے، خدمت تو بڑی چیز ہے، یہ حضرات تو اپنی قوم کی ذہنیت پست کرنے، اور اس کے ولولوں کا گلا گھونٹنے میں ہمیشہ سے نمایاں حصّہ لیتے چلے آئے ہیں۔

حالانکہ اگر یہ ضرورت سے زیادہ تن آسانیوں کے پرستار، تھوڑی سی توجہ بھی صرف کرتے تو اُن کی متفقہ دولت، ہندوستانیوں کو اس وقت خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچا چکی ہوتی۔

لیکن ان کا روپیہ تو صرف ہوتا ہے کونسل بازیوں۔ عیش پرستیوں، حُکّام نوازیوں گھوڑدوڑوں۔ ہاکیوں، اور کُتّوں پر۔

سازِ عشرت کی گونج میں اُن کی رنگین شب بیداریاں ٹھیک اُس وقت شروع ہوتی ہیں، جب عین ان کی دیوار کے نیچے، اِن کے فاقہ کش بچے روٹی مانگتے مانگتے سو جاتے ہیں۔

یہ امراء جو محض بخت و اتفاق کی بدولت "امراء" کہے جاتے ہیں، اپنے کو سطحِ انسانیت سے بالا، اور مخلوق کو سطحِ حیوانیت سے بھی فروتر سمجھتے ہیں۔

یہ مخلوق سے اِس قدر عجز و عبادت، اور حمد و ثنا کا مطالبہ کرتے ہیں، جتنا خدا بھی نہیں کرتا۔

سرمایہ داروں کی یہ خطرناک جماعت اور امراء کا یہ ہولناک ادارہ، انسانوں میں غلوے نفس، خودداری۔ اخلاقی جرأت، خودشناسی، اور راست بازی پیدا کرنے کی عوض ان میں دنائت، مسکنت، دروغ بافی، سازش، بزدلی، طمع، اور خوشامد پیدا کرنے کا ارتکاب کیا کرتا ہے۔

ان امراء کی دولت ایک ایسی مکروہ دارالضرب ہے جس میں معائب کے سکے ڈھلا کرتے ہیں۔

اپنے ملازموں، مصاحبوں، عزیزوں اور متوسلین کے ساتھ تخلّق و مدارات پیش آنا ان کی کھٹکتی ہوئی شریعت میں حرام مطلق ہے۔

یہ اربابِ دول "کوئی ہے" کی فرعونی آوازوں سے اپنے ملازموں کو پکارتے ہیں۔ اپنے کو "سرکار"، "خداوندِ نعمت"، "حضور"، اور "جہاں پناہ" کہلواتے ہیں، اور دوسروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذات اور اپنے "انا" کی نفی کرتے ہوئے اپنے کو "فدوی"، "خادم"، اور "خانہ زاد" کہیں۔

انھوں نے اپنے متوسلین کی ہمتیں یہاں تک توڑ رکھی ہیں کہ انھیں اس کا کامل یقین ہو چکا ہے کہ اگر وہ ان کے دربار سے نکال دیئے گئے تو بھوکوں مر جائیں گے

امراء کے فریب خوردہ ملازم اور متوسلین اپنے کو دریا میں ڈوبی ہوئی مچھلی فرض کئے ہوئے ہیں۔ جو اُسی وقت تک لبریز ہے، جب تک کہ دریا میں ڈوبی رہے۔ اور اگر اسے پانی سے نکال لیا جائے، تو ایک لمحے میں خالی ہو کر رہ جائے۔

اس کے علاوہ ایک کا ایک محبوب خبط ہوا کرتا ہے، اور جب تک اُن کے محبوب خبط کو اپنے اوپر طاری نہ کر لیا جائے اُن کے دربار تک رسائی نا ممکن ہے یہ ارباب زر سلاموں، اور خطابوں کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ اور اگر کسی کے خط کا جواب دیتے بھی ہیں تو پرائیویٹ سکریٹری کے ذریعے سے اور صرف دو سطروں میں۔

کاش سلام کے باب میں بھی وہ یہ بندوبست کر دیں کہ جب کوئی انھیں سلام کرے تو ان کا چوبدار اُن کی طرف سے سلام کا جواب دے دیا کرے۔ تموّل واستبداد کا ازل سے یہ چلن رہا ہے کہ وہ اپنے سے بہتر افراد کو اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتا کیونکہ اپنے سے بہتر افراد سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اُس کا مورد ثی غرور پاش پاش ہونے لگتا ہے۔ اور اس کا ہمیشہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُمراء کے گرد و پیش، نااہلوں جاہلوں، خوشامدیوں، منافقوں اور مسخروں کے لشکر جمع ہو جاتے ہیں۔

درباروں میں نااہلوں اور مسخروں کے ہجوم سے تین سخت ہولناک نتائج مُرتّب ہوتے ہیں۔

(۱) رئیس کی ذات میں ایک بہتر انسان اور اعلیٰ حاکم بننے کی تمام صلاحیتیں رفتہ رفتہ فنا ہو جاتی ہیں۔

(۲) (الف) یہ نااہل اور مسخرے اپنے رُسوخ سے بہ خصوصیت کے ساتھ اُن قابل افراد کا سر کچلنے میں مشغول رہتے ہیں۔ جن کی طرف سے اُنھیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر وہ دربار میں پہونچ گئے تو پھر ہماری پرسش نہ ہوگی۔

(ب) چونکہ یہ نااہل اور مسخرے نہایت ہی ذلیل مسالے کے بنے ہوتے ہیں

اس وجہ سے اپنی دربار رسی کا رعب ڈال کر یا دوسروں کو غلط توقعات دلا کر رشوتیں لیا کرتے ہیں۔

(۳) اِن نا اہلوں اور مسخروں کا عروج دیکھ دیکھ کر دوسرے حوصلہ مند افراد جو دربار تک پہونچنے کو معراج سمجھتے ہیں۔ اس مغالطے میں پڑ جاتے ہیں یا انھیں مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ خوشامد، و نامرد۔ سازش، اور مسخرگی ہی دنیا میں عروج و تموّل کا سیدھا راستہ ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کمینہ اور مسخرہ بننے کی مشقیں شروع کردیتے، اور رفتہ رفتہ اپنے کو رذالت کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ جن میں سے دو چار تو اپنی سعیٔ پیہم کی بدولت مصاحب خاص یا درباری مسخرے کا منصب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور باقی تمام لوگ بیچ طبقے میں رہتے ہوئے اپنی کمینگی سے سوسائٹی کے تباہ کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ متوسطین کا طبقہ ہی ہر قوم میں ریڑھ کی ہڈی ہوا کرتا ہے۔ اگر اچھے پیمانے پر اُس کی ذہنی تربیت کردی جائے، اور یہ گروہ اپنی بے پایاں قوتوں پر مُطلع ہو جائے تو آنِ واحد میں دنیا کا نقشہ بدل دیا جاسکتا ہے۔ لیکن انتہائی قلق تو اسی بات کا ہے کہ امراء کے ہاتھوں سب سے زیادہ یہی طبقہ پامال اور ذلیل رہتا ہے۔ اور اس سے سوسائٹی کو جلد نقصان پہونچتا ہے۔ اس کی تلافی امکان سے خارج ہے۔

سعدی نے ان امرائے کرام اور سلاطینِ فلک بارگاہ کے باب میں۔

"گاہ بہ سلامے برنجند گاہ بہ دشنامے خلعت بدہند" کا کلیہ بنایا تھا۔

تمام دنیا کے اربابِ خرد سے، خواہ وہ کسی مذہب و ملت اور نسل و وطن کے ہوں دانشمندی اور عقل کے نام پر دریافت کیا جاتا ہے کہ اِن سلام سے رنجیدہ ہونیوالوں

اور ان گالیاں کھا کر خلعت بخشنے والوں کا وجود، عالم انسانیت کے حق میں زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ یا تریاق کا؟ یہ گروہ زمین کے لئے موجب برکت و سعادت ہے۔ یا باعث نکبت و نحوست؟ یہ طبقہ نوع انسانی کو پروان چڑھا رہا ہے۔ یا جسمانی اور ذہنی دونوں صورتوں سے مدقوق بنا کر ہلاکت کی طرف لئے جا رہا ہے؟

اس سلسلے میں مجھے یہ بھی پوچھنے کا حق پہونچتا ہے کہ اس انسانوں کا خون چوسنے والی سرمایہ داری کو آخر کس نے آزاد چھوڑ رکھا ہے؟

کیا قانون نے؟

اور اگر انسانی مساوات کے سرپرست، حقوق اولادِ آدم کے مُربّی، اور عدل و انصاف کے پروردگار قانون ہی نے اس درندے کو خون آشامی کے واسطے آزاد چھوڑ دیا ہے تو خدا کے لئے بتاؤ کہ اب عدل و انصاف کے واسطے کس کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے؟ اور انسانی دردمندیوں کی داد اس کرۂ خاکی پر کس سے لی جائے؟

قانون، قانون، پکارنے سے کوئی فائدہ نہیں، قانون، سرمایہ داروں کا ایک کھلونا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

لیکن میرے عزیز دوستو میں مایوس نہیں ہوں، میری آنکھیں ایک تابناک مستقبل پر جمی ہوئی ہیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ امرا یعنی پٹاریوں کے سڑے ہوئے انگور، قدرت کی بنائی ہوئی زمین پر اس طرح اکڑ اکڑ کر چل رہے ہیں گویا وہ زمین کا کلیجہ پھاڑ ڈالیں گے اور آسمان کے شامیانے میں سوراخ کر دیں گے؟

کیا تم ان غریبوں کا گوشت چبانے والوں کی چال نہیں دیکھتے، گویا آسمانوں

سے بلاؤں کا نزول ہو رہا ہے؟

اور کیا تمہیں تاریخ نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ سرمایہ داری کی یہ متکبّرانہ فرعونی وہامانی رفتار، اُسی وقت سب سے زیادہ اپنے مظاہرے پر مُصر ہوتی ہے جب کہ کامل تباہی اور مکمل ہلاکت کا غار صرف ایک قدم کے فاصلے پر رہ جاتا ہے۔ اور کیا تم نے نہیں سُنا کہ:۔

بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت

اگر چراغ لیکر دیکھا جائے تو ہندوستان سے بڑھ کر کوئی منحوس اور بدبخت ملک نہ ملے گا۔

یہ سرزمین تو اس قسم کی ہے کہ یہاں ایسی باتوں پر بھائی بھائی کا خون بہاتا رہتا ہے۔ جنھیں دوسرے ملکوں میں اس قابل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ اُن پر ایک لمحے کے واسطے بھی توجہ کی جائے۔

اس دوزخ کی آنکھ کے تارے ہندوستان میں آئے دن ایک نہ ایک نیا فتنہ اُٹھا کرتا ہے، اور اہلِ ملک ہر روز تازہ آویزشوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔
کبھی تو گائے باجے پر ہنگامہ ہوتا ہے، کبھی ناقوس و اذان پر پینترے بدلے جاتے ہیں، کبھی رام لیلا اور محرم کے جلوس پر سوڈے کی بوتلیں اور پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ کہیں پیپل کے درخت اور شاہ صاحب کے احاطۂ مزار پر خوں ریزیاں ہوتی ہیں۔ کبھی جلوسوں کے تقدم و تاخر پر تلواریں نکل پڑتی ہیں کہیں مدحِ صحابہ اور منقبت ....؟ پر فساد برپا ہو جاتا ہے، اور کبھی قادیانیوں اور احراریوں میں گلگنچ اور فوجداری ہوا کرتی ہے۔
اہلِ ہند کو مژدہ ہو کہ ان ہنگاموں کے دوش بدوش نہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے نام سے اب فتنے کا ایک نیا دروازہ اور کھل گیا۔

گانے باجے کی آویزشوں کے سلسلے میں تو دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیجاتی تھی کہ یہ عوام اور جُہلا کا فعل ہے۔ لیکن اس "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کے فتنے کا آغاز تو اُن لوگوں نے کیا ہے جو صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں، مُلک کے مشہور و معروف افراد ہیں، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بدبخت ہندوستان کے عظیم ترین سیاسی راہنما بھی ہیں۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کا ایک مضمون "بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت کے نام سے ——— موصول ہوا تھا، جسے پڑھ کر دل کو ایسا صدمہ ہوا جس کا اس سے پیشتر کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

اس پرشد" کے صدر ہندوستان کے سب سے بڑے روحانی اور سیاسی لیڈر مہاتما گاندھی، اور اس کے رُوحِ رواں وقت کے سب سے اعلیٰ ملوکیت شکن ہیرو پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مُسلمانی؟

مہاتما گاندھی پر یادش بخیر! میں ایک زمانے میں ایمان لے آچکا تھا اور سمجھتا تھا کہ قدرت نے ہندوستان کے نجات دلانے والے کو آخر پیدا کر ہی دیا۔

ہر چند اب وہ عقیدت باقی نہیں رہی، تاہم میں مہاتما کی اب بھی بے انتہا عزت کرتا ہوں، لیکن جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے، میری سیاسی امیدیں جواہر لال نہرو ہی سے وابستہ ہیں، کیونکہ پنڈت میں مجھے ایسی تڑپتی ہوئی زندگی کا نشان ملتا ہے جو مہاتما میں نہیں ہے اور نہ مہاتما کے سے انسان میں ایسی قوی اور قلعہ شکن زندگی پیدا ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے جواہر لال کا اس فتنۂ مدبرشد" کے بانیوں میں سے ہونا

میرے واسطے ایک ایسی روحانی اذیت ہے جو کسی طرح برداشت ہی نہیں کی جاسکتی جواہر لال کا سا انسان، اور فرقہ پروری کا دانستہ یا نادانستہ شکار ہو جائے ہندوستان کی اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے۔

جولیس سیزر پر جب قاتلانہ حملہ کیا گیا اور اُس نے دیکھا کہ حملہ آوروں میں اُس کا حکیم اور حلیم دوست "بروٹس" بھی شامل ہے، تو اس نے چیخ مار کر کہا، "بروٹس" تم بھی میرے قتل پر آمادہ ہو"، اور یہ کہہ کر اُس نے اپنا منہ چھپا لیا، تاکہ بہت جلد اُس کا خاتمہ ہو جائے۔

ہندو مسلم اتحاد کا بھی اس وقت یہی حال ہے، اور روحِ وطن چیخ رہی ہے کہ "جواہر لال تو بھی مجھے فنا کر دینے پر تُل گیا ہے؟"

ہندوستان کی موجودہ فضا میں بیباکی اور راست بازی کے ساتھ اظہار خیال کرنا ایک سخت مرحلہ بن چکا ہے۔ کیونکہ مدت کی سعی پیہم کے بعد ہماری یہ عادت ڈلوادی گئی ہے کہ ہم ہر بات کو فرقہ پروری کی عینک سے دیکھنے لگیں۔ اسی لئے مجھے سخت اندیشہ ہے کہ میرے اس بیان کو بھی فرقہ پروری کی عینک سے دیکھا جائے گا۔

لیکن میرے سیاسی عقاید سے کم از کم ہندوستان کا وہ تمام طبقہ جو اردو ادبیات سے دلچسپی رکھتا ہے، بخوبی واقف ہے کہ اگر آفتاب کے نیچے فرقہ پروری کا کوئی سب سے بڑا دشمن موجود ہے تو وہ میں ہوں۔

میں کامل بیس برس سے ہندوستان کو بیداری، مردانگی اور اتحاد کی جانب پکار رہا ہوں —— میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں صرف سیاسی اتحاد نہیں چاہتا کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ ہر وہ ہستی، یا شے جو سیاسیات سے آلودہ ہو جاتی ہے، اُس میں

نفاق سرائیت کرجاتا ہے۔

میں تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی رُوحوں میں اتحاد دیکھنا چاہتا ہوں اور میری عقیدے میں ہندوستان کی کامل نجات ناممکن ہے۔ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی ازدواج قائم ہو کر ان دونوں گروہوں کی تہذیب و معاشرت ایک نہ ہو جائے۔

آزادی و اتحاد کی سی مقدس چیز میں مذہب کا ٹھونسنا صرف ان خیرہ سروں کا وطیرہ ہو سکتا ہے جو یا تو ہندوستان میں پھُوٹ ڈالنے کی روٹی کھاتے ہیں، یا جن کی سرزمینِ دماغ قحط زدہ ہو کر خشک ہو چکی ہے۔

ل

دنیا جانتی ہے کہ اُردو، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے اور انھیں دونو کے آغوش میں یہ پروان چڑھی ہے۔

میں ہندوستان کے تمام باشندوں سے، خواہ وہ ہندو ہوں، یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی، بہ بانگ بلند یہ عرض کروں گا کہ ہندو مسلم اتحاد کی قدیم یادگار یعنی اُردو کو زندہ اور باقی رکھنا اِن کا سب سے بڑا قومی فریضہ ہے اور اگر خدانخواستہ اُردو کو فنا کر دیا گیا تو آج جو میں کہہ رہا ہوں اُسے سب سُن لیں، یاد رکھیں، بلکہ گرہ میں باندھ لیں کہ پھر اس سرزمین پر ہندو مسلم اتحاد کا خواب کبھی نہ دیکھا جا سکے گا۔ اور ہندو مسلمان اُس وقت تک ایک دوسرے کے دشمن اور غیر کے محکوم رہیں گے جب تک کہ آوازِ صُور، زمین اور آسمان کے پرخچے نہ اُڑا دے۔

دیکھو کہیں اُردو کو یہ نہ کہنا پڑے۔

خاک اڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

سیاسی انجمنیں

ہر ملک میں اتنی سیاسی انجمنیں ہوا کرتی ہیں، اور ہر انجمن تمام ملک کی نمائندگی کا اس بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کرتی رہتی ہے کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کس انجمن کو معتبر سمجھا جائے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ایک ایسے شخص کے لئے جس کا سیاسی مطالعہ محدود ہو یہ معاملہ سخت پیچیدہ اور صبر آزما ہوتا ہے کہ وہ کس جماعت میں شریک ہو، اور کسے اپنا لیڈر تسلیم کرے۔

یہ موضوع بہت کچھ خامہ فرسائی چاہتا ہے جس کے واسطے میں اس وقت بالکل تیار نہیں ہوں، البتہ اس مسئلے میں اگر میری ان دو ناچیز ہدائتوں کا خیال رکھا جائے گا تو دھوکہ کھانے کا امکان بہت ہی کم باقی رہ جائے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک متعدد و مختلف فرقے رکھنے والے مُلک کی ہر اُس انجمن سے گریز کرنا چاہیئے جو ملک کے مجموعی اور عموعی مفاد کو پسِ پُشت ڈال کر کسی خاص جماعت کے تحفظ کی خاطر عالمِ وجود میں لائی گئی ہو۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ایک محکوم مُلک کی ہر اُس انجمن سے پناہ مانگنا چاہیئے جس کی باگ اُن حضرات کے ہاتھوں میں ہو جن کے ناموں کے ساتھ خطابوں کے دُم چھلّے لگے ہوئے ہیں۔

اب اِن باتوں کی سرسری سی تشریح بھی سُن لیجئے۔

(الف) اِس بیسویں صدی میں خصوصیت کے ساتھ، راہنما اور لیڈر بننے کا شوق، ایک عالمگیر وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے، اور ہر وہ شخص جو دو سطریں لکھ سکتا، اور دو چار جملے بول سکتا ہے، اس کا تمنائی ہے کہ اُسے لیڈر تسلیم کر لیا جائے لیکن حقیقی لیڈری، چونکہ خود اپنے ہی خون میں نہالنے کا نام ہے، اِس لئے یہ اربابِ غرض اس طرف تو رُخ کر ہی نہیں سکتے، البتہ اپنی ہوس کو آسودہ کرنے کی خاطر لیڈری کی نقالی شروع فرما دیتے ہیں اور لیڈری کی نقالی یوں کی جاتی ہے کہ وہ جس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اُس کے حقوق کے تحفظ کی ایک فرضی سی انجمن بنا کر اپنے فرقے کی علمبرداری کے ڈھول پیٹنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرقے میں مقبول و ہر دلعزیز بن جاتے ہیں۔ شہر کے عمائد اور حُکام میں اُن کی پرسش ہونے لگتی ہے اور آخر کار وہ اپنی تقریباً اُن تمام پوشیدہ تمناؤں کو نکال لیتے ہیں جو اس سوانگ کے بغیر نکل ہی نہیں سکتی تھیں۔

یہ ہے راز اُن تمام شاندار انجمنوں اور لیگوں کا جو کسی ایک خاص فرقے یا کسی ایک خاص گروہ کے حقوق کے تحفظ کی خاطر خلق فرمائی جاتی ہیں۔

(ب) اب رہی دوسری بات، یعنی ہر اُس انجمن سے پناہ مانگنا چاہیئے جس کی باگ خطاب یافتہ حضرات کے ہاتھوں میں ہو، سو اُس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ دنیا کی کوئی بدیسی گورنمنٹ اپنی رعایا کو کبھی عزت کی نگاہ سے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ ہر حاکم قوم، اپنے محکوم قوم کو چوپاؤں سے بدتر سمجھنے پر مجبور ہوتی ہے لیکن اس کے باوصف ہر حکومت اپنے محکوموں کو خطابات سے ضرور سرفراز کرتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی گورنمنٹ

اس وقت تک چل ہی نہیں سکتی، جب تک کہ محکوم قوم کے افراد اس کا ہاتھ نہ بٹائیں۔ لیکن محکوم قوم کے افراد کو خطاب دینے سے پیشتر ہر حکومت سو سو مرتبہ خوردبین لگا لگا کر بڑی احتیاط کے ساتھ اس بات کی جانچ کر لیتی ہے کہ جسے خطاب دیا جانے والا ہے، وہ

(۱) اپنی قوم اور اپنے وطن کا درد تو سینے میں نہیں رکھتا؟

(۲) آزادی کا تو طلبگار نہیں ہے؟

(۳) حکومت کی خاطر اپنے وطن سے غداری کرنے میں پس و پیش تو نہیں کریگا؟

(۴) احساس، راستباز، غیر تمند، رقیق القلب، شریف اور خوددار تو واقع نہیں ہوا ہے؟

اور جب حکومت کو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ان تمام متذکرہ بالا خطرناک عیوب سے پاک ہے تو اُس وقت وہ ایک شفیق باپ کی طرح خطاب کا بوسہ اُس کے ماتھے پر ثبت کر دیتی ہے۔

بہ الفاظِ دیگر، سرکاری خطاب، حکومت کی طرف سے ایک مُصدّقہ اعلان ہوتا ہے اس بات کا کہ ہر ممکن بلڈ اگزامنیشن (BLOOD EXAMINATION) (خون کا امتحان)، اور ہر ممکن خوردبین کے ذریعے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ خطاب یافتہ "حُبِ وطن" اور "شرافت" کے امراض سے قطعی طور پر منزّہ اور پاک ہے۔

اور جب خطاب یافتہ بزرگوں کی حالت یہ ہے تو انصاف سے کہئیے کہ اس نامراد انجمن کے شعبہ دواسازی میں، جس کے ہاسپٹل انچارج، اور صدر الاطبّا یہ مُصدّقہ شرفاء قوم ہوں، کسی مُلک کے واسطے زہر تیار ہو سکتا ہے، یا تریاق؟۔

اَودھ کے زمیندار اور تعلقدار

اس تکلیف دہ موضوع پر قلم اُٹھانا، ایک نہایت ہی خشک اور نامطبوع خامہ فرسائی میں مبتلا ہوتا ہے۔

کسی فرد یا جماعت کی عیب شماری کوئی محبوب مشغلہ نہیں کہی جاسکتی، لیکن بعض اوقات اجتماعی و عمومی مفاد، یا خود اُسی فرد، یا جماعت کی خاطر اس قسم کے ناپسندیدہ فرائض انجام دینا ہی پڑتے ہیں۔

یہ زمیندار و تعلقدار اُن نامور افراد کی نسل ہے جو بزمانۂ شاہی بڑی بڑی جاگیروں کے مالک، اور بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے۔

لیکن اِن بزرگواروں میں سے بعض نے تو ناعاقبت اندیش امارت کے نشے میں اپنے اخلاف کی تعلیم و تربیت کی ہی نہیں، اور بعض نے ان کی تعلیم کو صرف "گلستاں" "بوستاں" تک محدود رکھا اور وہ بھی اس طرح کہ بچوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ کاش انھیں معلوم ہوتا کہ اُن کے بچے آئندہ زمانے کی امانت ہیں اور مستقبل کے سانچے میں ڈھالنے کے عوض اُنھیں شاہی عہد کی تعلیم و تربیت ہی میں محصور رکھنا ایک دن خود ان کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

جس کا نتیجہ ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ زمیندار اور تعلقدار عصر حاضر

کے علمی و عملی تحریکات اور وقت کے آئینِ حیات کی دوڑ میں سب سے پیچھے کیا، کہیں نظر ہی نہیں آ رہے ہیں۔

ہندو علم الاصنام میں تمام دیویوں اور دیوتاؤں کی سواریاں مقرر ہیں۔ علم کی دیوی "سرستی" کی سواری "ہنس" ہے اور دولت کی دیوی "لکشمی" کی سواری "اُلو" ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے امراء کے اقوال و افعال کو عقل سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا

دولت کی ناروا تقسیم، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کے تمام فتنوں کی جڑ ہے اور خصوصیت کے ساتھ، دولت اِس شکل میں کہ وہ وراثت کے ذریعے سے منتقل ہوتی ہوئی باپ سے بیٹے، اور بیٹے سے پوتے تک پہنچے۔ ایسی ہولناک صورت اختیار کر لیتی ہے کہ اُس کے ورثاء ذہنی اور جسمانی دونوں حیثیتوں سے مدقوق ہو کر رہ جاتے ہیں۔

زندگی کی آویزشوں میں مردانہ وار حصّہ لینے کے عوض، آباء کی چھوڑی ہوئی دولت پر زندگی بسر کرنے والے اس قدر کاہل، کُند ذہن، پست حوصلہ، تن پرور، وہم پرست، خود بیں، رُسوم نواز اور جھوٹی عزّت کے دلدادہ ہوتے ہیں کہ ان بیچاروں میں یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی کہ وہ کارزارِ حیات میں ایک بہادر سپاہی کے فرائض انجام دے سکیں۔

یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ یہ گرم و سرد ناچشیدہ کانوں کے بڑے کچے ہوتے ہیں لیکن شکایت کرنے والے یہ غور نہیں کرتے کہ کانوں کے سوا اِن غریبوں کے پاس اور ہے ہی کیا؟ ان کے پاس دماغ ہوتا ہی کہاں ہے کہ وہ خود کوئی فیصلہ کر سکیں، اس لئے یہ بیچارے کانوں ہی سے دونوں کام لے لیتے ہیں۔ کانوں ہی سے سُنتے اور کانوں ہی سے سوچتے بھی ہیں۔

چونکہ اُودھ کے زمیندار اور تعلقدار، رئیس ابنِ رئیس، اور پوتڑوں کے امیر ہیں

اس لئے اگر وہ تمام عیوب اِن کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں جنھیں موروثی دولت پیدا کیا کرتی ہے تو اِس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے۔

یہ زمیندار و تعلقدار، ایک ایسے ناقابلِ علاج جمود میں مبتلا ہیں کہ اس کی نظیر تلاش کرنے کے لئے ہمیں قدیم ترین مقبروں میں جانا پڑے گا اور ان کے مشاغل کی فہرست مرتب کرنے کی خاطر، حکام وقت کے آستانوں سے لیکر اُن تمام بدنام گلیوں تک سے گزرنا پڑیگا، جہاں صنفِ نازک کا حسن ہر ممکن اہانت و عفونت برداشت کر لینے کی قسم کھا چکا ہے۔

قومی و ملی امور کی رونق بڑھانے سے گریز کرنا، اور وطنِ عزیز کی خدمت کے تصور سے بھی لرز اُٹھنا تو خیر اُن کی دیرینہ سُنّتِ آباء کے مطابق ہے ہی، لیکن یہ خدا کے بندے تو اپنے ملک کی معاشرتی و مجلسی اصلاح کے کاموں میں بھی حصہ لینا، اپنی شانِ امارت کے خلاف، اور اپنے آبائی وقار کے منافی سمجھتے ہیں۔

ان کے تکبر کی نوعیت بھی عجیب ہے۔ اپنے ملک کے عوام تو کیا خواص تک سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ لیکن حکام بالا تو بڑے ہیں، یہ ایک معمولی سے "نائب تحصیلدار صاحب" تک کی خوشامد کرنے کو سعادتِ دارین سے کم نہیں سمجھتے۔ اور ایک معمولی سب انسپکٹر کو "داروغہ جی" کہتے کہتے ان کی زبانیں خشک ہو جاتی ہیں۔

قرض لینا، ڈالیاں دینا، بڑھاپے میں کنواریوں سے شادی کرنا، کونسلوں اور چھوٹے چھوٹے الکشنوں میں سرگرداں رہنا۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں کی "چیرمینی" کے لئے مارے مارے پھرنا، کتے پالنا۔ ایک دوسرے کی غیبت کرنا، رقص و سرود کی

محفلیں برپا کرنا، ہاکی اور پولو کھیلنا، خطابوں کے واسطے سرگرداں رہنا۔ آنریری مجسٹریٹی کے واسطے دوڑنا، بیگمی پان کھانا اور خمیرہ تمباکو پینا، یہ ہے اُن کے عام اور گفتنی مشاغل کی فہرست اور اس کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باقی جو ہے ناگفتنی ہے۔

جذبۂ خوشامد کے سدھائے ہوئے دُبلے اور مسکین چہروں والے مصاحبوں اور تمنائے زراندوزی کے پروان چڑھائے ہوئے ترکانہ عشووں والی عورتوں کے حلقے میں زندگی بسر کرکے مرجانا۔ ان حضرات کی سب سے بڑی دنیوی عشرت اور اُخروی نجات ہے۔

مختصر یہ کہ "انسانوں" کا یہ قابلِ رحم گروہ، علم و اخلاق سے بیگانہ، ضروریات زمانہ سے بےخبر، مسائل حاضرہ سے ناواقف، عمل و حرکت سے محروم اور ایک صحیح زندگی بسر کرنے کی بصیرت سے ناآشنا اور قطعی ناآشنا ہے۔

سوچنا چاہیئے کہ ہم اُن کی کیا مدد کرسکتے ہیں؟

اب رہی ان کی اقتصادی حالت سو وہ اس حد تک عبرتناک ہو چکی ہے کہ جس زمیندار یا تعلقدار کے گھر جائیے وہاں اُسی فیصدی یہی رونا ہے کہ اب دادا کی عزت ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔

اکثر و بیشتر اس طبقے کا بال بال قرض سے جکڑا ہوا ہے اور حکومت کے جدید قانون نے تو اِن غریبوں کی رہی سہی جان بھی نکال لی ہے۔ جس کی رُو سے کسانوں کو سات آٹھ آنے فی روپیہ "چھوٹ" دے دی گئی ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ پہلے جس کی آمدنی تھی پانچ سو روپے ماہوار، اب اس کی آمدنی ہے صرف ڈھائی سو، اُس پر طرہ یہ ہے کہ ان بیچاروں کے ذمے عزیزوں کے گزارے بھی ہیں جنھیں

ایک پائی کی بھی کمی روا نہیں رکھی جاتی۔ اور اسی کے دوش بدوش سرکاری مالگذاری بھی ہے۔ مہاجنوں کا اصل مع سُود بھی۔ اور کسانوں کے ذمے بقایا بھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عزیزوں کے گزاروں کی قرقیاں، مہاجنوں کی ڈگریاں اور سرکاری مالگذاری کے وارنٹ، آئے دن ان کا تعاقب کیا کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو مالگذاری نہ ادا ہوتے پر انھیں حوالاتوں میں بھی ٹھونس دیا جاتا ہے۔

زمیندار اور تعلقدار، ڈپٹی کمشنروں، اور کمشنروں کے سامنے دانت نکال نکال کر اپنا دُکھڑا روتے پھرتے ہیں۔ اپنی اور اپنے آبا کی وفاداریاں گناتے ہیں۔ اپنے جنگ عظیم کے تمغے اور سندیں پیش کرتے ہیں۔ امن سبھاؤں کے فروغ، اور کانگرس کی شکست میں اپنی عرق ریزیوں کی طویل فہرستیں میزوں پر رکھتے ہیں، اور رو رو کر، گڑگڑا گڑگڑا کر رحم کی التجائیں کرتے ہیں۔ مگر یہ ان تعلقداروں کی دو دو سو دعوتیں کھائے ہوئے حکام عالی مقام ”دِل ہم کچھ نہیں کرسکتا“ کی گونج میں اُنھیں بہ عجلت تمام اپنے کمروں سے رخصت کردیتے ہیں۔

جسے یاد نہ رہا ہو پھر یاد کرلے کہ یہ اودھ کے زمیندار اور تعلقدار ہمیشہ حکومت کے وفادار اور جاں نثار رہے ہیں، اور اس مُنہ نہ لگانے کے زمانے میں بھی اگر آج حکومت کا ذرا سا اشارہ بھی پائیں تو اپنے بال بچوں تک کو گھر سے باہر نکال دیں لیکن شاید اُنھیں معلوم نہیں کہ اب ہوا کدھر چل رہی ہے۔ اور دنیا کی سیاست اب اس کی بہ شدت تمام مقتضی ہے کہ ہر حکومت اپنے قدیم وفادار زمینداروں اور تعلقداروں کے بوسیدہ اوارے کو خودکشی کا موقع دے کر کسانوں اور مزدوروں کو ہات میں لے لے۔

میری اس عبارت سے کوئی یہ دھوکا نہ کھائے کہ میرا یہ مضمون زمینداروں اور

تعلقداروں کی ہمدردی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ یا میں خدانخواستہ یہ چاہتا ہوں کہ ان سرمایہ داروں کو پھر اس کا موقع دے دیا جائے کہ وہ غریبوں کو پہلے کی طرح کچلنے لگیں ——— میرا تو تمام تر مقصد اس خامہ فرسائی سے صرف اس قدر ہے کہ اودھ کے زمیندار و تعلقدار میری اس بکواس کو ٹھنڈے دل سے سُنیں، اُس پر غور کریں۔ اپنے دیرینہ شعار پر ناقدانہ نگاہ ڈالیں، اور اپنی موجودہ پستیوں کو عبرت کی آنکھوں سے دیکھیں اور پھر کوئی ایسا راستہ اختیار کریں جو اُنھیں جُمود، رُسوائی، بے زری، بے عزتی، خوشامد، اور جھوٹی عزت کے مغالطے سے نکال کر ایک ایسی سطح پر لے آئے کہ وہ غیور، جفاکش خوددار، اور حسّاس انسانوں کی جماعت میں داخل ہو سکیں۔

چار یار

اے بادِ صبا، ایں ہمہ آوردۂ تست

مذہب "مذہب" مذہب" ایک غلغلہ ہے، ایک شور و غوغا ہے، ایک طوفان ہے، ایک ہنگامہ ہے۔ ایک ہلچل ہے جو مذہب کے نام سے ہندوستان کے طول و عرض میں جاری و ساری ہے۔

مذہب، مذہب کی آوازیں در و دیوار سے آرہی ہیں "مذہب" اوڑھنا ہے اور "مذہب" بچھونا۔

جدھر نظر اُٹھایئے ایک "دینی اُچھل کود"، ایک مذہبی گلچھپ ہے اور ایمانی تو تو میں میں۔

ہندوستان ہی وہ مقام ہے جہاں "مذہب" کے باعث لوگ ایکدوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ ننگے جا رہے ہیں، اور یہی وہ سرزمین ہے جہاں "مذہب" کی آڑ میں لوہا برسا کرتا ہے۔ حالانکہ یہ بیسویں صدی ہے۔

جس طرح بڑے بڑے شہروں کی مرکزی منڈیوں اور تاریخی مقامات کے بڑے بڑے سالانہ میلوں میں، ہزاروں آدمیوں کی بیک وقت چیخ پکار ایک خوفناک مخلوط گونج کی صورت اختیار کر لیتی ہے، یہی حال ہمارے بدنصیب ملک کا ہے

جہاں کی فضا ہولناک مذہبی للکاروں سے ہر آن گونجا کرتی ہے۔

اور جس خیراتی لنگر خانوں سے پلٹے ہوئے گداگروں کے ہاتھ میں ایک روٹی، ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح ہمارے ملک میں جسے دیکھئے ایک "مذہبی جھن جھنا" ہات میں لئے بجا رہا ہے۔

معاشرت ہو یا تجارت، سیاست ہو یا تمدن، صحت ہو یا بیماری، سفر ہو کہ حضر اور موت ہو کہ زیست، غرضکہ زندگی کے ہر شعبے، اور حیات کے ہر محکمے میں "مذہب" سرایت کئے ہوئے ہے۔

اس سے زیادہ حیرتناک بات کیا ہو گی کہ فنونِ لطیفہ کی سی شے پر بھی جسے "مذہب" سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے "مذہب" کی مہریں لگی ہوئی ہیں اور "دین" کا گودنا گدا ہوا ہے۔

آئے دن اِس جنت نشان دوزخ میں یہ شرمناک خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ فلاں "مذہبی جلوس" کے موقع پر سوڈوں کی بوتلیں پھینکی گئیں اور فلاں نامعلوم الاسم شخص کے "مزار" کی حرمت قائم رکھنے پر گولیاں چل گئیں، اور فلاں "مذہبی رسم" کے ناموس پر اتنے افراد جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

دور سے دیکھنے والا اس دھوکے میں پڑ جائے گا کہ اگر روئے زمین پر کہیں مذہب باقی رہ گیا ہے تو وہ ہندوستان اور صرف ہندوستان ہے۔ لیکن اگر ادراک و شعور کو بیدار کر کے اِن پرستارانِ "مذہب" کا قریب سے مطالعہ کیا جائے تو یہ عبرتناک حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ یہ "مذہب" کے فدائی اور یہ "دین" کے شیدائی، اگر اس دنیا کی تمام چیزوں میں سے کسی چیز سے کلیتہً اور قطعی طور پر بیگانہ بے بہرہ ہیں تو وہ "مذہب" اور یقینی طور پر صرف مذہب ہے۔

قدرت کی یہ کتنی عبرتناک ستم ظریفی ہے کہ اُس نے "مذہب" کی قیادت کے لئے ایک ایسی قوم کو منتخب کیا ہے جو سرے سے کوئی مذہب ہی نہیں رکھتی اور جسے مذہب کی حقیقی تعریف تک کا علم حاصل نہیں ہے۔

ہاں اگر مذہب مبنی ہے، مذہب سے کُلی عدم واقفیت و جہل پر، اور اگر مذہب نام ہے تعصب، تنگ نظری، مُنافرت، خون ریزی، بد معاملگی، خود غرضی، غداری اور دغابازی کا، تو میں اس کٹے ہوئے وسیع بر اعظم میں وہ سب سے پہلا انسان ہوں، جو ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کرے گا کہ اے آدم کے بیٹو، اس ظلمتکدہ عالم میں اگر "دینداری" کہیں زندہ ہے تو اُس معمورۂ کفر و الحاد میں اگر "مذہب" کہیں سانس لے رہا ہے تو وہ مقام مقدس ہندوستان ہے" اور صرف ہندوستان۔

اور اگر کوئی مجھ سے ہندوستان کی "دینداری" کا ثبوت طلب کریگا تو میں مقدس چوپاؤں کی کھالیں، مقدس درختوں کی چھالیں، مقدس دریاؤں کا پانی، مقدس عبادت گاہوں کا چونا۔ اور مقدس جلوسوں کی مٹی مٹھی میں لیکر اُس کے سامنے نچوڑوں گا اور کہوں گا دیکھ، یہ ہے میرے مذہبی شہدار کا خون۔

ہندو ہوں کہ مسلمان، مجھے سب کی مذہبیت معلوم ہے، اور دونوں کے نفوس میری بصیرت کے سامنے بے نقاب ہیں۔ اور اسی بنائے محکم پر میں نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر دین یہی ہے، جس پر آج ہندو مسلم قایم ہیں تو قسم ہے چشمۂ ہدایت و حیات کی کہ ایسے "دین" سے "بیدینی" کا مرتبہ بمراحل بلند و ارفع واقع ہوا ہے۔

یورپ کی "بیدینی" اور ہندوستان کی "دینداری" میں فرق یہ ہے کہ وہ

تفکر و تدبر پر قایم ہے اور یہ تقلید و تعصب پر۔ اُس میں تحقیق کا عنصر غالب ہے اور اس میں روایات و اوہام کا۔ اور اس اندھیر نگری میں یہ کہنے کی جرأت کون کر سکتا ہے کہ "تحقیقی کفر" بہتر ہے "تقلیدی ایمان" سے اور "امن پرور بے دینی" کو تفوق حاصل ہے "فساد انگیز دینداری پر"

کاش کوئی اللہ کا بندہ غور کرنے کی جرأت کرے!

جولائی کے آخری ہفتے میں لکھنؤ کے سے تمدن پذیر شہر میں "مدح صحابہ" کا ایک مقدس جلوس نکلا تھا۔ جسے پولیس نے گرفتار کر لیا۔

آپ اس "مقدس جلوس" کے باب میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ کیا واقعی یہ جلوس "مقدس" تھا؟ کیا اسے "مذہبی جلوس" کا خطاب دیا جا سکتا ہے؟

کیا اسلام نے اس نوع کے "جلوس" نکلنے، اور اس طرح سڑکوں پر شور و غوغا مچانے کی کبھی اور کسی حالت میں بھی اجازت دی ہے ——— اور کیا رسول اکرمؐ کی بعثت سے لیکر انتزاعِ سلطنتِ اودھ تک اس قسم کی سر راہ نعرہ زنی کا کہیں کوئی پتہ چلتا ہے؟

تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ اس ہنگامے کے پس پشت ہے کیا؟ کیا بتاؤں کیا ہے۔ ع۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے

اس کے پس پشت جو کچھ ہے، آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی ——— یعنی ان تمام شورشوں کا مقصود و مدعا صرف اس قدر ہے کہ شیعوں کی دل آزاری ہو اور سنیوں شیعوں میں کبھی اتحاد نہ ہو سکے۔

کیا سنجیدگی، تہذیب اور انسانیت ایسے اشخاص کو "دیندار" کہہ سکتی ہے جو اپنے بھائیوں کی دل آزاری، اسلام کی بے رونقی، اور امنِ عامہ کی بدتری کیواسطے شاہراہوں پر جلوس نکال نکال کر چلاتے پھرتے ہیں۔

ذرا اسی طرح میں شیعوں سے بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مدح صحابہ سنتے ہی آپ کا جامے سے باہر ہو جانا کیا اس قابل ہے کہ آپ کو داد دی جائے اور آپ کی "وہابیت" پر ایمان لے آیا جائے؟

یہ بات بہتر ہزار مرتبہ غور کرنے کے بعد بھی میری عقل میں نہیں آتی کہ اگر کوئی جماعت اپنے راہنماؤں کی تعریف کرتی ہے اور گلی کوچے اُس کے ڈھول پیٹتی پھرتی ہے تو اس سے کسی دوسرے کے اخلاق میں کیا نقص۔ اور کسی دوسرے کے ایمان میں کیا ضعف پیدا ہو سکتا ہے؟

"رام، رام" یا "رادھے کرشن" کہنے والے ہندو پر کیا اس نقطۂ نظر سے حملہ کر دینا واجب ہے کہ وہ ان لوگوں کے نام لے رہا ہے جنھیں ہم مانتے نہیں ہیں؟

اگر ان ہنگاموں میں صرف نوعمر لڑکے ہی شریک ہوتے تو چنداں افسوس نہ ہوتا مگر قیامت تو یہ ہے کہ ان آویزشوں میں فریقین کے وہ سالخوردہ بزرگ حصہ لے رہے ہیں جن کی سفید ڈاڑھیاں فرشتوں سے ملتی جلتی اور جو بہت سے نواسوں کے نانا اور بہت سے پوتوں کے دادا ہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ یہ کبڈی کھیلنے والے دادا اور نانا اپنے چھوٹوں کو کیونکر منہ دکھاتے ہوں گے؟

یہ ایک بڑی دردناک صورتِ حال ہے کہ اس اندھے ہندوستان میں ہر سال بے گنتی قومیں، بے شمار جسم، اور لاتعداد جانیں، اغیار کی فتنہ پروری، روایات کی

بازیگری، اور مُنافرت وادہام کی قاتلانہ مسخرگی بُے دریغ بھینٹ چڑھ جاتی ہیں ———
بعض بدنام تالابوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر بارش میں ایک بھینٹ لیا کرتے ہیں
مگر ہندوستان کا "مذہب" وہ تالاب ہے جو آئے دن ایک نہیں، ہزاروں بھینٹیں،
لیا کرتا ہے۔ اور لوگ ہیں کہ اُس میں غسل کرنے کو ذریعہ نجات سمجھے ہوئے ہیں۔

میں اپنے تمام ہندوستانی بھائیوں سے خواہ وہ مسلم ہوں کہ ہندو، سکھ ہوں کہ
پارسی، عیسائی ہوں کہ بدھی۔ دست بستہ یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر وطن عزیز کسی صحیح مذہب
کی صحیح پیروی سے قاصر ہو چکا ہے اور اگر طبیعت حقیقی مذہب کی طرف عود کرنے سے کلیتہً انکار
کر چکی ہے، اور اگر یہ "اوہام ورسوم" جن میں ہندوستان گرفتار ہے صحیح مذہب سے کوئی
دُور کا بھی تعلق نہیں رکھتے" ہیں، تو آیئے آج ہم آپ سب مل کر اپنی کامل بے دینی
کا اعلان کر دیں۔ اور مناروں پر چڑھ چڑھ کر پکاریں کہ دنیا والو ہم نے مذہب کے مقدس
ادارے سے رہائی حاصل کر لی ہے۔ آج کی تاریخ سے "ہندوستان" کے علاوہ ہمارا
کوئی مذہب نہیں ہے۔ ہم نے اپنے دِلوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی رُوحوں سے یہ محکم پیمان
کر لیا ہے کہ اب ہمارا مذہب" ہندوستان اور صرف "ہندوستان" ہوگا
ہم آج کے دن سے اگر جئیں گے بھی تو ہندوستان کے لئے، اور مریں گے بھی تو
صرف ہندوستان ہی کی خاطر!

مرا عہد لیست با جاناں کہ تا جاں در بدن دارم
ہوا داریٔ کوُیش را چو جانِ خویشتن دارم

عصرِ حاضر کے ہلاکو، اور اُنکے مقتول

اس عہد کے ہلاکو اپنے آباء یعنی ہلاکو، بُبرو اور چنگیز کی طرح سیدھے، سادھے اور گنوار واقع نہیں ہوئے ہیں کہ انسانوں کو علانیہ مُولی، گاجر کی طرح کاٹ کر رائے عامّہ کو اپنے خلاف برانگیختہ کر کے اپنے کو خطرے میں ڈال لیں۔

ان کا جذبۂ خُون آشامی ارتقاء پذیر ہو چکا ہے ــــــــــــــــ اور انھوں نے قتال کے وہ دلچسپ اور نیکنام طریقے اختیار کر لئے ہیں کہ پُرانے ہلاکوؤں کی طرح انھیں کوئی "ڈاکو" اور "خونی" نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس انھیں "امن کے دیوتا" کے نام سے پُکارا جاتا ہے۔

عہدِ بربریت و وحشت کے ہلاکو اپنے جذبۂ قتال کو "قتال" ہی کی صورت سے پیش کرتے تھے۔ اس لئے کہ انہیں پالش کرنے کا فن خوب آتا ہے۔

پُرانا ہلاکو اپنے جذبۂ خونریزی کو تلوار کے ذریعے سے آسودہ کرتا تھا ــــــــ نیا ہلاکو تلوار استعمال نہیں کرتا، وہ یونی ورسٹیوں اور پروپیگنڈے وغیرہ کے ذریعے سے قتل کرتا ہے۔

پُرانا ہلاکو وحشی تھا اس لئے انسانوں کے سر وتن میں جدائی کر دیتا تھا ــــــــ نیا ہلاکو شائستہ ہے، وہ کبھی اس طرح نہیں قتل کرتا کہ مقتول کے سر وتن میں جدائی

ہو جائے۔

پرانا ہلاکو "بے رحم" تھا، اس لئے وہ علانیہ خون بہاتا رہتا تھا ——— نیا ہلاکو "رحمدل" واقع ہوا ہے، اس لئے اس خوبصورتی سے قتل کرتا ہے کہ مقتول کے خون کی ایک بُوند بھی زمین پر نہیں گرنے پاتی۔

پُرانا ہلاکو "غیر دانشمند تھا، اس لئے اسی طرح قتل کرتا تھا کہ مخلوق فریاد کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی ——— نیا ہلاکو خیر سے "دانشمند" ہے اس لئے اس حُسن و خوبی سے قتل کرتا ہے کہ اور تو اور، خود مقتول اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو جاتا ہے۔

پرانا ہلاکو بیک گردشِ شمشیر انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا تھا، نیا ہلاکو سُست اثر زہر کی طرح رگ و پے میں سرایت کر کے ہلاک کرتا ہے۔

پُرانا ہلاکو، کھلے ہوئے میدانوں میں خون بہاتا تھا ——— نیا ہلاکو لاکھوں روپے کی بڑی بڑی عمارتوں کے اندر خون پیتا رہتا ہے۔

پرانا ہلاکو گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ کی گُونج میں ہلاکت کا بازار گرم کرتا تھا ——— نیا ہلاکو حریر و پرنیاں کی سرسراہٹ اور ناطق فلموں کے زمزموں کے سائے میں ذبح کرتا ہے

پُرانا ہلاکو مار ڈالتا تھا ——— نیا ہلاکو زندہ رکھتا ہے اور ایسی ہولناک نُقطۂ ہلاکت پر زندہ رکھتا ہے کہ اُس کا مقتول، تمام عمر سسکتا ہی رہتا ہے اور اُس کی تمام زندگی ایک مرگِ طویل نزع بن کر رہ جاتی ہے۔

پُرانا ہلاکو، جسموں پر حملہ کرتا تھا ——— نیا ہلاکو جسموں کا احترام کرتا ہے، لیکن

روحوں کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔

پُرانا ہلاکو، اپنے خلاف جذبۂ نفرت پیدا کرتا تھا ــــــ نیا ہلاکو اپنے سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ اور اس کے مقتول قتل ہو جانے کے بعد اپنے میں زیادہ توانائی محسوس کر کے اُسے چاہنے لگتے، اور اس قدر چاہنے لگتے ہیں کہ اُس کی ہر ادا کی نقالی شروع کر دیتے ہیں ـــــــــ

میرے اس متذکرہ بالا بیان کی روشنی میں اگر آپ اُن تمام اقوام کی سیرت و کردار پر نظر ڈالیں جو اس وقت اجنبی قوموں کی محکومیت میں ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ حرف بحرف دُرست ہے۔

اگر آپ آزاد قوموں کا مطالعہ کریں گے تو یہ دیکھیں گے کہ اس دورِ انقلاب میں اگر اُن کے نوجوان بدلے بھی ہیں تو اپنے ہی مُلکی و معاشری آداب کے سانچوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بدلے ہیں ـــــــ اور اس تبدیلی کے باوصف وہ اپنے آباؤ اجداد ہی کا ایک نمونہ ہیں۔ ہر چند اس نمونے کو ہم "جدید" یا ارتقائی نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

آزاد قوموں کے نوجوان سمجھتے ہیں کہ ارتقار کے معنی قلبِ ماہیت یا دوسری قوموں کی نقّالی نہیں ہو سکتے۔

لیکن اگر آپ محکوم و مغلوب قوم کے نوجوان کا مطالعہ کریں گے تو افسوس کے ساتھ یہ دیکھیں گے کہ اس میں اس کے وطنی خصوصیات اور آبائی کردار کا کہیں کوئی پتا نہیں چلتا اور اس نے اپنی حاکم قوم کے تمام اوضاع و اطوار کو آنکھیں بند کر کے اس طرح قبول کر لیا ہے کہ وہ اپنی سرزمین کی پیداوار ہی

نہیں معلوم ہوتا۔ اور اپنے وطن میں وہ ایک مسافر و اجنبی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، نیز اُس کی تمام ہستی اور اُس کا تمام وُجود ایک زندہ جھُوٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور لُطف یہ ہے کہ وہ اس "زندہ جھُوٹ" سے صرف خوش ہی نہیں اس پر فخر بھی کرتا ہے، اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ نئے ہلاکو نے اُس کے جسم کو تو باقی رکھا ہے، مگر اُس کی رُوح کو کچل کر رکھ دیا ہے ؎

سمجھے گا اُس کا درد کون شورشِ کائنات میں
تو نے جسے مِٹا دیا پردۂ التفات میں

محکوم ممالک کے "حُکّام"

آزاد ممالک کے تمام تر سرکاری عُمّال، چھوٹے ہوں کہ بڑے، ہر وقت اُسی دُھن میں رہتے ہیں کہ پبلک کی زیادہ سے زیادہ خدمت کیوں کر کی جائے، اور وہ کون نئی راہیں نکالی جائیں کہ مخلوق ہر امکانی امن و آسائش سے بہرہ مند ہو سکے۔

جس قدر اُن کے منصب و اقتدار میں اضافہ ہوتا ہے اُسی قدر ان کی افادیت و خوش خلقی کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

وہ پبلک کو اپنا مخدوم، اور خود کو اس کا خادم سمجھتے ہیں، اور انکی شرافت انھیں کبھی یہ بھولنے نہیں دیتی کہ ہمیں جو تنخواہ اور تنخواہ کے ذریعے جو روٹی ملتی ہے وہ دراصل پبلک ہی کی بخشی ہوئی ہوتی ہے۔ اور ہمیں اپنے رزق رسانوں کی خدمت کے معاملے میں ہر ممکن قربانی پر ہر آن آمادہ رہنا چاہیئے۔

لیکن وہ ممالک جو محکوم پابزنجیر ہوتے ہیں وہاں معاملہ اس کے برعکس اور یاس انگیز حد تک برعکس ہوتا ہے۔

ان ممالک میں اوّل درجہ کے "حُکّام" دراصل "حُکّام" نہیں، بلکہ "دیوتا" اور دیوتا بھی سیتوجی کی طرح ہلاکت و غارتگری کے دیوتا ہوتے ہیں

انھیں صرف تین باتوں کی فکر ہوتی ہے۔

۱۔ ملک پر اپنی گرفت، اور اپنے رُعب و اقتدار کو محکم سے محکم تر کرنا۔

۲۔ ہر ماہ اپنی تنخواہ مع الاؤنس وغیرہ وصول کرنا۔

۳۔ اور محکوم کے قوم کی آخری بُوند تک اپنی قوم کے جسم میں پہنچا دینے کی تدبیریں نکالنا۔

ان کے بعد دوسرے درجے کے حکام کی باری آتی ہے۔ جن کے غرور کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اپنے والدین تک سے سیدھے مُنہ بات کرنا اپنی "سرکاری پوزیشن" اور اپنی "حاکمانہ شان" کے منافی سمجھتے ہیں۔

انھیں کبھی یہ وہم بھی نہیں ہوتا کہ ہم "پبلک سرونٹ" یا "خادم خلق" ہیں، وہ اپنے جاہ و جلال کی نمود اور اپنے کرّوفر کی نمائش بسا اوقات ایسے احمقانہ و سفیہانہ انداز سے کرتے ہیں کہ اربابِ نظر کو ان کے چھچھورے پن پر اگر ایک طرف ہنسی آجاتی ہے تو دوسری طرف ان کے دماغ کی شرمناک حد تک کمزوری و بے مائگی پر ترس آنے لگتا ہے۔

یہ اپنے اجلاسوں پر اِس طرح اکڑ کر بیٹھتے ہیں، گویا ان کا جسم گوشت پوست سے نہیں، بلکہ سلاخوں اور کنکریٹ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اور موت بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔

اہلِ مقدمہ کو بات بات پر ڈانٹ بتا دینے، اور وکلاء کو ذرا ذرا سے سہو پر جھڑک دینے میں یہ حضرات ایک رُوحانی لذّت محسوس کرتے ہیں اور "حضور والا" اور "سرکار" سُن کر انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آلہ سماعت کے ذریعے سے شہد پی رہے ہیں۔

اب رہا تیسرے درجے کے حکّامِ "عالی مقام" کا طبقہ، سو مخلوق آزاری کے

معاملے میں وہ اپنے تمام بالاتر "حکام" سے بالاتر ہوا ہوتا ہے۔

یہ تھرڈ کلاس "حکام" ہر وقت اس گھات میں لگے رہتے ہیں کہ

۱۔ پبلک کو کس طرح زیادہ سے زیادہ مرعوب و دہشت زدہ رکھا جائے؟

۲۔ مخلوق کو کیونکر زیادہ سے زیادہ ستایا اور لوٹا جائے؟

۳۔ اور جو اُن کے ذوقِ تکبّر اور ہوس زر اندوزی و رشوت ستانی کا اپنے کو بہ آسانی شکار نہیں ہونے دیتے، یا جن کی خودداری اور جن کے روایات اُنھیں اِسکی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان تھرڈ کلاس "حکام" کے سامنے سر جھکائیں، اُن کے متعلق اس فکر میں لگے رہنا کہ وہ "حکام بالا" کی نظروں میں اِتنے ذلیل کر دئے جائیں کہ ان پر بہ آسانی جھوٹے مقدمات دینے کا موقع ہات آجائے۔

ان تھرڈ کلاس "حکام" کے بعد "حکام" کا ایک چوتھا طبقہ بھی ہوتا ہے۔ اور وہ طبقہ اس قدر ہولناک ہوتا ہے کہ اُس کی بداخلاقی اور کمینگی دُنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ غریبوں کا ستانا، ان کا مال جبراً لے لینا اور ان کی عزتوں کو گھڑی بھر میں خاک میں ملا دینا، اُن کے بائیں ہات کا کھیل ہوتا ہے۔ محکوم ممالک کے ہر بڑے شہر میں روز یہ تماشا دیکھنے میں آتا ہے کہ معمولی کانسٹبل شریف ترین راہروؤں سے جانوروں کا سا برتاؤ کرتے ہیں، تانگے اور ٹیکسی والوں سے نذرانے وصول کرتے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر انھیں کوڑے مارتے ہیں، اور جو ذرا سا بھی قانون و انصاف کا مطالبہ کرتا ہے، اُس کا چالان کر دیا جاتا ہے اور معاملہ فہم و قابل "مجسٹریٹ"، اس مظلوم پر جرمانہ کر کے پولیس کے مظالم کے انسداد کی تمام اُمیدوں کو بیک گردشِ قلم خاک میں ملا دیتا ہے۔

اِسی طرح ہر شہر کی میونسپلٹی، صحت عامّہ کے تحفظ کی خاطر ایسے انسپکٹر مقرر کرتی ہے جو اس امر پر سختی سے نگاہ رکھتے ہیں کہ بازاروں میں ایسی چیزیں ہرگز فروخت نہ ہونے پائیں جن میں کسی قسم کی آمیزش ہو۔ یا وہ سڑی گلی ہوں۔

لیکن محکوم ممالک میں یہ محکمہ بھی، تمام دیگر محکموں کی طرح ایک خطرناک جرگے" کی صورت اختیار کئے رہتا ہے۔

ان ممالک میں سڑے ہوئے پھل، اور چربی ملایا ہوا گھی، نیز وہ تمام چیزیں دھڑلّے کے ساتھ فروخت کی جاتی ہیں۔ اور اِن جراثیم فروش دوکانداروں کو محض اس تنہا بنیاد پر پبلک میں وبائیں پھیلانے کا لائسنس دے دیا جاتا ہے، کہ وہ ان انسپکٹروں کے گھر خورونوش کا سامان بے قیمت پہنچاتے، اور اُس کے ساتھ ساتھ "نذرانے" بھی ماہ بماہ پیش کرتے رہتے ہیں

غرضکہ محکوم قوم کو صرف حاکم قوم ہی تباہ نہیں کرتی۔ بلکہ حاکم قوم کے نوکر چاکر بھی، جو خود اُس کے ہم قوم ہوتے ہیں، اُس کی ہڈیاں چبایا کرتے، اور اس کا خون پیا کرتے ہیں۔

اگر محکوم قوم کو دنیا کی کسی قوت سے دادرسی کی اُمید ہو سکتی ہے تو وہ قوت موت اور صرف موت ہے۔

انسانی فطرت اور "خیر و شر"

سوال یہ ہے کہ نظریاتِ "خیر" و "شر" کی رُو سے آیا انسان مائل بہ "خیر" ہے، مائل "شر" یا یوں کہئے کہ قدرت نے آیا اُسے مادہ "خیر" زیادہ دیا ہے یا مادہ "شر"؟

اِس سلسلے میں سب سے پہلے جس شے پر نظر پڑتی ہے، وہ خود نظریۂ "خیر و شر" ہے کہ "خیر و شر" ہے کیا؟

اس باب میں ارباب کی یہ رائے ہے کہ "خیر" و "شر" کوئی حقیقی شئے نہیں، محض اضافی و اعتباری چیز ہے۔ اور اِس کی ایک "اصطلاح" سے زیادہ کوئی حیثیت تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ پھر جب "خیر" و "شر" محض ایک اضافی، اور اساسی بنار پر غیر حقیقی چیز ہے، تو ایک اضافی و غیر حقیقی شئے کا کسی ذی حیات کی فطرت کے اندر تلاش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اسی کے دوش بدوش اکثر مفکّرین کا یہ بھی خیال ہے کہ انسان ایک محض سادہ و غیر مُنقّش فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے، جسے "خیر" و "شر" یا "نیکی" "بدی" سے کوئی تعلق نہیں ہوتا — اور یہ ماحول ہے جو اُس کے افکار و کردار کو "نیکی" "بدی" یا "خیر" و "شر" کے اضافیات و اعتبارات سے منسوب کر دیتا ہے۔

اِن متذکرہ بالا اُمور کی رُو سے، انسان کے فطری طور پر مائل بہ "خیر" یا مائِل بہ "شر"

ہونے کے سوال کے حل کرنے کے لئے ہمیں

۱۔ "خیر" و "شر" کے معنی متعین کر کے انسان کی فطرت پر غور کرنا پڑے گا۔
۲۔ انسان کی فطرت کے سادہ و غیر منقش ہونے کے مسئلے کو جانچنا ہوگا۔
۳۔ اور ماحول کی حقیقت اور اس کی اثر انگیزی پر نظر ڈالنا پڑے گی۔

(الف)

"خیر و شر" کے معنی کا تعیّن اور انسانی فطرت

یہ کہا جاتا ہے کہ "خیر و شر" کی سی اعتباری و اضافی شئے کا فطرتِ انسانی کے اندر تلاش کرنا بے معنی سی بات ہے ——— لیکن اگر ہم "خیر و شر" کو اصطلاحی معنی میں نہ لیں، اور اُسے "نیکی بدی" "اچھائی برائی"، "زشت" و "خوب"، "معصیت و معصومیت اور مقبولیت و مقہوریت" کے تمام تصورات سے قطعی طور پر معرا کر کے استعمال کریں تو پھر اُس کا فطرتِ انسانی کے اندر تلاش کرنا ہرگز ایک بے معنی سی بات نہیں ہو سکتا۔

میرا اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر ہم انسان کی قانون شکنی، دروغ بافی، امن سوزی، اور خون ریزی وغیرہ کے واقعات کو "شر" کا خطاب دیں، اور اس کی قانون پرستی، راستبازی، امن پروری، اور انسانی ہمدردی وغیرہ کو "خیر" کے لفظ سے پکاریں، تو "خیر و شر" کی اس تعریف کی رُو سے "خیر" و "شر" کا فطرتِ انسانی کے اندر تلاش کرنا بالکل درست اور قطعی جائز ہوگا، اور پھر اس میں یہ واقعات صورتِ حال میں اس تلاش و جستجو پر یہ اعتراض وارد نہیں کیا جا سکتا کہ ایک اضافی و اعتباری شئے کا کسی ذی حیات کی فطرت کے اندر ڈھونڈنا ایک مہمل سی بات ہے۔

اور جب "خیر" و "شر" کے اس واقعاتی مفہوم کی روشنی میں ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ آیا انسان بالطبع مائل "بہ خیر" ہے کہ مائل بہ "شر" تو ہمارے واسطے اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے، کہ ہم مشاہدہ و تاریخ کی رُو سے اس امر پر نگاہ ڈالیں کہ نوعِ انسانی کے مجموعی افکار و کردار کی ہمیشہ نوعیت کیا رہی ہے، اور انسانیت کا سوادِ اعظم آیا ہر زمانے اور ہر عہد میں "خیر" پر قائم رہا ہے کہ "شر" پر؟

اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے بچوں کے مجموعی افکار و کردار پر غور کرنا پڑیگا، اس لئے کہ فطرتِ انسانی کی تحقیقات کے معاملے میں بہترین نمونہ بچے ہی ہو سکتے ہیں دنیا کی تمام قوموں کے بچوں کے مجموعی افکار و کردار کا کامل مطالعہ کرنے کے بعد نہایت آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج تک کسی ماں نے کوئی ایسا مائل بہ خیر یا صالح و سعید بچہ نہیں جنا، جو ایک گھٹے ہوئے سر پر چپت رسید کرنے کے عوض، کسی مریض کے پاؤں دباتے دیکھا گیا ہو ——— اور جو شور و غل، توڑ پھوڑ، اور مار پیٹ سے منہ موڑ کر کسی مکتب یا عبادت گاہ کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچہ کسی فعل کو ضرور کرے، تو آپ اُس سے یہ کہہ کر دیکھ لیں کہ خبردار ایسا نہ کرنا، اور آپ کو یہ دیکھ کر تعجب ہو جائے گا کہ بچہ اُس ممنوع فعل کو اور بھی زیادہ شوق و اصرار کے ساتھ کر رہا ہے ——— اور اس سے آپ کو پتا چل جائیگا کہ قدرت نے اُس کی فطرت کو نافرمانی اور سرتابی کا جوہر کس بے باکانہ فیاضی کے ساتھ مرحمت فرمایا ہے۔

ایک طرف تو سوسائٹی ایک مدتِ دراز سے بچوں کے فطری میلانات اور جبلی رجحانات پر قابو حاصل کر کے اُنھیں اُن تمام اُمور پر قائم کر دینے کی دُھن میں لگی ہوئی ہے

جنھیں "خیر" کہا جاتا ہے ——— لیکن حسب مُراد کامیابی نہیں ہوتی۔

اور دوسری طرف دنیا میں ازل کے روز سے کوئی ادارہ اس مقصد کے ساتھ اب تک قایم نہیں ہوا ہے کہ بچوں کو "شرارت" کی تعلیم دی جائے۔ لیکن بچے ہیں کہ آئے دن نت نئی شرارتیں ایجاد کرتے رہتے ہیں ——— اور اس سے مفکرین کا دماغ اس فیصلے کی جانب مائل ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "شرارت" کوئی سکھائے جانے کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اسے ماؤں کے پیٹ ہی سے لے کر نکلتے ہیں

آخر صورتِ حال اس کے برعکس کیوں واقع نہیں ہوئی ہے؟ یعنی بچے اپنی فطری میلانات سے مجبور ہو کر کسی بیمار کے پاؤں کیوں نہیں دباتے۔ اور کسی سوتے ہوئے آدمی کے سر پر پانی کا گھڑا توڑ کر کیوں بھاگ جاتے ہیں؟

کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ بچے "بیمار کے پاؤں دبانے" کو تو آگے چل کر والدین اساتذہ، ماحول اور اخلاقی کتب سے سیکھتے ہیں اور سوتے ہوئے کے سر پر پانی کا گھڑا توڑ کر بھاگ جانے کو کسی سے سیکھتے نہیں۔ بلکہ فعل ان کی جبلّت و سرشت میں بالکل اسی طرح داخل ہے جس طرح مچھلی کا بچہ پیدا ہوتے ہی تیرنے لگتا ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو کیا "خیر" محض ایک اکتسابی شئے ہے، اور "شر" کلیتہً فطری؟

اب بچوں کو چھوڑ کر ذرا بالغوں کی طرف آیئے۔

انسانی نفسیات، اور انسانی حیات کے نباض، اس واقعہ صریحی کی گواہی دینے کے لئے ہر وقت آمادہ نظر آتے ہیں۔ اور بے شمار رنگیں و شہور کی رازداں تاریخ کے بوسیدہ اوراق بھی اس حقیقت کبریٰ کی ناقابل انکار شہادت دینے پر آن تُلے رہتے ہیں کہ انسان، طلوعِ تاریخ سے لے کر، اس بیسویں صدی تک ان تمام

اصول و افراد سے برسرِ پیکار رہا۔ اور آج بھی ہے جنھیں اِس دنیا میں "خیر" کا حامل و حامی کہکر پکارا جاتا ہے

اس آسمان کی ڈاٹ کے نیچے انسان کیا کیا سفاکیاں کر چکا ہے، اور اس زمین کے فرش پر انسانی خود کامیوں اور حوصلہ مندیوں نے کتنی ہولناک مقدار میں خون بہایا ہے ـــــ یہ وہ عبرتناک حوادث ہیں جن سے پڑھے لکھے لوگ واقف ہیں اور یہ وہ دردناک واقعات ہیں، جن کے بیشمار ثبوت ایک ایسے ناقابلِ تصور انبار کی صورت میں موجود ہیں کہ اگر انھیں ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے پر چُنا جائے تو ایک ایسا مینارہ بلند تعمیر ہو سکتا ہے جس پر چڑھ کر ہم مریخ کے باشندوں سے سرگوشی کر سکتے ہیں۔

دیکھنا چاہیئے کہ اس عالمِ "کون و فساد" میں "خیر" کے کتنے مُناوی و مبلغ اب تک آ چکے ہیں ـــــ اور انسانیت نے اُن سے ہمیشہ کیا برتاؤ کیا ہے؟

اگر کوئی یہ کہے کہ انسان نے مبلغانِ "خیر" کے ہمیشہ اتباع کیا، اور اُن کے آستانوں پر سر جھکایا ہے، تو مجھے اُس کے علم کے نقص اور اس کے مشاہدے کی خامی پر افسوس ہوگا۔

اگر کسی کے پاس کوئی تاریخی ثبوت ہے تو میرے اس سوال کے جواب میں پیش کرے کہ کیا انسان نے مبلغانِ "خیر" کا ہمیشہ خم ٹھونک کر مقابلہ نہیں کیا؟ انہیں مجلسوں میں نہیں ڈالا؟ اُن کی پشت پر کوڑے نہیں مارے؟ اُنہیں کانٹوں کا تاج نہیں پہنایا؟ اُن کے سامنے زہر کا پیالہ نہیں پیش کیا؟ اور اُنھیں مُولی گاجر کی طرح کاٹ کر نہیں رکھدیا؟

اور یہ تمام درندگیاں اور یہ تمام شقاوتیں کیوں روا رکھی گئیں؟ کیا یہ تمام شقاوتیں محض اس تنہا بنیاد پر روا نہیں رکھی گئیں کہ مبلّغان "خیر" انسان کو اس حلقے کی طرف دعوت دیتے، اور پکارتے تھے جسے حلقۂ "خیریت" کہا جاتا ہے؟ اور کیا تاریخ اس کے برعکس بھی کوئی شہادت پیش کر سکتی ہے؟ یعنی کیا کسی عہد، اور کسی دَور میں فعلِ "خیر" پر بھی انسانیت کا اجتماع اسی صورت سے رہا ہے، جس طرح ہمیشہ، مرکز "شر" پر رہتا چلا آیا ہے؟ اور اربابِ "شر" بھی کیا کبھی اتنی حقیر اقلیت میں رہ چکے ہیں، حقیقی حقیر اقلیّت میں اربابِ "خیر" ہمیشہ سے رہتے چلے آئے ہیں؟

اس باب میں بعض وہ حضرات جو انسانی فطرت سے خوش عقیدگی رکھتے ہیں، ایک نہایت ہی باریک مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، اسے بھی سن لیجئے ——————

یہ خوش عقیدہ جماعت کہتی ہے دُور کیوں جاؤ، اپنے ہی عہد کو دیکھ لو کہ اس وقت دنیا میں چور، ڈاکو، فتنہ پرور، قانون شکن اور قاتل زیادہ ہیں کہ نیک معاش افراد؟ سو میری اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ یہ ایک اصطلاحِ قانونی کا پردردہ سطحی مغالطہ ہے —————— یعنی قانون یہ کہتا ہے کہ اس وقت تک ہر شخص نیک اور شریف ہے۔ جب تک کہ کسی قانونی جرم کا ارتکاب کر کے سزا یافتہ نہ ہو جائے —————— جس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام افراد جو بالقوّۃ ڈاکو، مفسد، قانون شکن اور خونی ہیں۔ اور زمانے کی نامساعدت، یا حماقت، یا بزدلی کے باعث اپنی تمام "خبیث" تمناؤں کو دلوں میں گھونٹ گھونٹ کر رکھ دیتے ہیں، اور ارتکابِ جرم نہیں کرتے۔ نیز وہ تمام عملی چور، ڈاکو، جعل ساز، غاصب، اٹھائی

گیرے، اور قاتل، جو اس چالاکی کے ساتھ جرم کرتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔ اور انتہائی پوشیدگی کے ساتھ جرائم کرنے کے باعث جن پر مقدمات نہیں چلائے جا سکتے، اور انھیں سزائیں نہیں دی جا سکتیں

ان سب خطرناک لوگوں کو شرافت و معصومیت کا مجسمہ سمجھ لیا جائے۔

آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ یہ نظریہ کس قدر مجروح اور غلط ہے، اور فطرتِ انسانی کی تحلیل کرنے والے کیونکر اس غلط نظریئے سے مطمئن ہو سکتے ہیں ——

کیونکہ اگر نفوس میں "شر" موجود ہے تو خواہ وہ "شر" کتنی ہی غیر عملی یا مجہول ہو، بہرحال اُسے "شر" ہی کہا جائے گا۔ اور ایسے مائل بہ "شر" نفوس رکھنے والوں کو اربابِ "خیر" کے خطاب سے ہرگز سرفراز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ "شر" کے کسی وجہ سے معطّل رہنے کو فقدانِ "شر" سے منسوب کرنے کی غلطی کے ارتکاب کو کم سے کم اربابِ نظر تو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں لگے ہاتھوں ایک اور بات پر بھی غور کرتے چلیے۔

یہ تو آپ کو، جیسا کہ ابھی ذکر ہو چکا ہے، معلوم ہی ہے کہ انسان نے "مبلغانِ "خیر" کا ہمیشہ خم ٹھونک کر مقابلہ کیا ہے، اور اُس حلقے میں داخل ہونے سے ہمیشہ اِبا کیا ہے جسے حلقہ "خیریت" کہتے ہیں۔

اس باب میں سوچنا یہ ہے کہ "خیر" فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، یا مخالف و مغائر؟

اگر "خیر" فطرتِ انسانی کے مطابق ہوتی تو انسان اُسے بخندہ پیشانی قبول کر لینے میں پس و پیش کیونکر کر سکتا تھا؟

بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر "خیر" مطابق فطرت ہوتی ہو تو برسر پیکار ہونا تو بڑی بات ہے۔ انسان کی یہ مجال نہ تھی کہ اُس سے سرمو انحراف بھی کر سکتا ــــــ کیونکہ یہ کسی ذی حیات کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی فطرت یا متعلقات فطرت سے لڑنے یا انحراف کرنے کا تصور بھی کر سکے۔

غور کرنا چاہیے کہ تمام عالم انسانیت کا ازل کے دن سے کسی چیز کے قبول کرنے سے انکار کرنا، مسلسل انکار کرنا، ہمیشہ اور ہر عہد میں انکار کرنا اور مسلح ہو کر انکار کرنا اور انکار کرتے ہی رہنا، کیا اِس بات کا ناقابلِ انکار حد تک ثبوت نہیں ہے کہ وہ شئے فطرتِ انسانی سے مغائر، اور اُس کے قطعی مخالف واقع ہوئی ہے؟۔

کیا کسی مچھلی کی فطرت نے پیرنے، اور کسی پرندے کی جبلت نے اُڑنے سے کبھی بغاوت کا تصور بھی کیا ہے؟

ہر زمانے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان نے "خیر" اور اُمورِ "خیر" کی پابندی سے ہمیشہ اپنے کو محفوظ رکھنے کی سعی کی ہے ــــ یہ اس کا خوف ہی تنہا دلیل اس بات کی ہے کہ "خیر" اُس کی فطرت اور افتادِ مزاج کے موافق و ہم آہنگ واقع نہیں ہوئی ہے۔

اِس موقعے پر مجھے کانپور کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک روز کشتی پر سوار ہو کر میں گنگا کے اُس پار گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ شیر دودھ پی رہا ہے، اور یہی نہیں کتے کے ساتھ ایک ہی ظرف میں دودھ پی رہا ہے، اور شیر کو "حیوان صالح" بنا دینے والا سادھو تماشائیوں کی زرپاشیوں اور تعریفوں کا مرکز و موضوع بنا ہوا ہے۔

اس وقت یکایک یہ بات میرے ذہن میں آئی اس نے تو بڑا کام کیا ہے، لیکن کیا کسی ذی حیات کی فطرت کا مسخ کر دینا کوئی قابلِ فخر یا شائستہ فعل ہو سکتا ہے، اور شیر کے

بگڑی بنا دینے کو کوئی شایانِ تحسین کارنامہ ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ ——— اور اُسی کے ساتھ معاً یہ خیال بھی میرے دل میں بجلی کی طرح چمک گیا کہ اگر "خیر" ہماری فطرت کے مطابق واقع نہیں ہوئی ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر ہم نے اُسے اپنے اوپر حاوی ہونے کا موقع دے دیا تو رفتہ رفتہ ہماری فطرت کو مسخ کر کے رکھدیگی؟

(ب) اب دوسرے مسئلے کی جانب رُخ کیجئے۔

غیر منقّش فطرت

کہا جاتا ہے کہ انسان محض ایک "سادہ و غیر منقّش" فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے، اور صرف ماحول اُس کے افکار و کردار کو "خیر" و "شر" سے منسوب کردینے کا ذمہ دار ہے۔ ماحول کے متعلق، جیسا کہ میں طے کر چکا ہوں، آخر میں لکھوں گا۔ اِس حصّے میں صرف یہ دیکھنا ہے کہ انسانی فطرت کی "سادگی" کا نظریّہ دُرست ہے کہ غلط۔

انسان کی فطرت کے "سادہ و غیر منقّش" ہونے کے نظرئیے کو جہاں تک اِنسانِ اوّل کی پیدائش کا تعلق ہے، کسی حد تک ضرور قابلِ لحاظ سمجھا جا سکتا ہے یا اگر زیادہ فیاضی سے کام لیا جائے تو پیدائشِ اِنسانی کے بالکل ابتدائی دَور تک شاید اسے کسی حد تک تسلیم کر لینے پر ادراک کو رضامند کیا جا سکتا ہے۔ ہر چند یہ واضح رہے کہ اِس کو کسی حد تک تسلیم کر لینے کے معاملے میں بھی بہت سی باریک بحثوں کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن اب جبکہ اِنسانی تولید و تناسل کا کارواں بہت آگے نکل جا چکا ہے، اور ہم سب کے سب، دیگر مؤثرات داخلی و خارجی کے دوش بدوش، ایک نامعلوم مُدّت سے اپنے لاتعداد و نامعلوم آبا و اجداد کے افکار و کردار کو بطور وراثت

حاصل کرتے چلے آرہے ہیں تو اس منزل پر یہ کہنا قطعی بے معنی ہوگا کہ اب بھی "انسان ایک ,, سادہ و غیر منقش" فطرت لے کر عالمِ وجود میں آتا ہے۔

بلکہ اس کے برعکس ہمیں قدرتی طور پر اب یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ توریث کے زیرِ اثر اب انسانی فطرت "سادہ و غیر منقش" نہیں رہی ہے بلکہ ایک نا معلوم مدت سے انسان ایک "منقش و رنگین" فطرت لے کر پیدا ہوتا چلا آرہا ہے۔

لیکن "سادہ و غیر منقش" فطرت کے حامیوں کے سامنے جب مسئلے کے اس متذکرہ بالا رُخ کو پیش کیا جاتا ہے تو ہر چند انھیں یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ بچے کی فطرت پر آبائی افکار و کردار کے نقوش ضرور ہوتے ہیں لیکن اُسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعوے بھی کرتے ہیں کہ یہ آبائی افکار و کردار کے نقوش، گہرے نہیں ہوتے اور بچے کی "فطرتِ اصلی" کی بالائی سطح تک ہی محدود رہتے ہیں اور اُس کی زیریں تہوں تک اُن کی رسائی نہیں ہوتی۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ انسانی عقل و شعور کے پاس وہ کون ایسی زبردست خوردبین، یا وہ کون ایسے نازک ترین آلات ہیں، جن سے "دو اور دو چار" کی طرح یقینی طور پر یہ پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ آبائی افکار و کردار کے نقوش، بچے کی "فطرت اصلی" کی بالائی سطح تک ہی پہونچتے، یا پہونچ سکتے ہیں ـــــــ اور اُس سے نیچے اُن کی رسائی نا ممکنات میں سے ہے؟

میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ بچے کوئی انفرادی "ذاتی فطرت" نہیں رکھتے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو انسانوں کے افکار و کردار میں جو تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں وہ ظہور پذیر ہی نہ ہو سکتیں۔ لیکن اس کے یہ معنی کیونکر ہو سکتے ہیں کہ بچہ "قطعی" "سادہ و غیر منقش"

فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔

(ج) اب رہا مسئلے کا تیسرا رُخ یعنی

ماحول

اس میں ذرہ برابر بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ہمارے فطری رجحانات جبلّی خصوصیات اور ہمارے افکار و کردار کے ابھارنے، یا دبانے یا انھیں طرح طرح کے سانچوں میں ڈھالنے کے معاملے میں ماحول کو بے پایاں دخل حاصل ہے۔ لیکن میرا موضوع بحث اس سے مختلف ہے۔ میں تو ماحول پر ایک قطعی مختلف نظریئے کی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

میرے نزدیک ماحول کے لفظ کے استعمال کرنے والے اکثر ایک زبردست مغالطے کے شکار ہو جایا کرتے ہیں — یعنی وہ ماحول کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا وہ ایک جیتا جاگتا، اور سانس لیتا ہوا وجودِ خارجی ہے — حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ "ماحول" سوسائٹی کے مجموعی افکار و کردار اور ان کے عام اثرات کے سوا اور کوئی معنی ہی نہیں رکھتا — یعنی اگر ہم کسی ماحول کو بُرا کہتے ہیں تو اُس کے صرف یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ سوسائٹی کے ارکان و افراد کی ایک جماعت کثیر کے افکار و کردار اور اُن کے اثرات نامطبوع ہیں۔ اور اسی طرح جب ہم کسی ماحول کو اچھا کہتے ہیں تو اُس کے بھی صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ سوسائٹی کے ارکان و افراد کی ایک جماعتِ کثیر یا سوادِ اعظم کے افکار و کردار، اور اُن کے عام اثرات مطبوع و محبوب واقع ہوئے ہیں۔

سادے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ اگر میں یہ کہوں کہ آجکل ہندوستان کا ماحول بہت خراب ہے، تو اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہندوستانیوں کا سوادِ اعظم یا ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے افکار و کردار کی رُو سے نہایت خراب حالت میں ہے۔

اور جب کہ مشاہدہ و تاریخ سے یہ بات، ناقابلِ انکار دلائل کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے کہ دنیا کا ماحول ہمیشہ خراب اور وابستۂ "شر" رہا ہے، تو کیا اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم ہمیشہ پابندِ "شر" رہا ہے؟ اور کیا انسانیت کے سوادِ اعظم کا ہمیشہ اور ہر عہد میں پابندِ "شر" رہنا اس بات کی ایک اور واضح دلیل نہیں ہے کہ قدرت نے انسانیِ فطرت کو "شر" کا مادہ "خیر" کے مقابلے میں بمقدارِ کثیر ودیعت فرمایا ہے۔

قاعدہ ہے کہ دینے والے کے پاس جو شئے کثیر مقدار میں ہوتی ہے، وہی دی بھی زیادہ جاتی ہے۔ اور جو شئے قلیل ہوتی ہے، وہ دی بھی کم جاتی ہے۔ فرض کیجئے میں خیرات کرنے بیٹھتا ہوں، میرے داہنے ہات کے توڑے میں صرف چند ہزار روپے ہیں، اور میرے بائیں ہاتھ کے توڑے میں کئی لاکھ پیسے۔ اب جو میں خیرات شروع کروں گا تو ظاہر ہے کہ روپے کم دوں گا اور پیسے زیادہ، بلکہ بہت زیادہ۔

تو کیا کم "خیر" اور زیادہ "شر" دینے والی قدرت کے متعلق ہم یہ رائے قائم کریں کہ وہ "شر" کو زیادہ مقدار میں دینے پر اس لئے مجبور تھی کہ "خیر" کا ذخیرہ ہی اُس کے پاس کم تھا؟

بعض اربابِ رائے کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ قدرت نے "خیر" و "شر" دونوں مادّے فطرتِ انسانی کو ارزانی فرمائے ہیں۔ وہ جس مادّے کو چاہے بڑھالے، اور جسے چاہے گھٹا دے۔

اگر ایسا ہے تو کوئی اس بات کا جواب دے کہ آخر یہ خطرناک حیوان جسے انسان کہتے ہیں یہی کیوں کیا کرتا ہے کہ ہمیشہ اپنے مادۂ "خیر" کو گھٹا دیتا، اور مادہ "شر" کو بڑھا لیتا ہے؟ آخر انسان کو "شر" اس قدر محبوب کیوں ہے؟

دوسری بات اِن حضرات سے دریافت طلب یہ ہے کہ قدرت نے کیا یہ دونوں مادّے بہ احتیاطِ تمام تول کر مساوی حیثیت سے اِنسان کو بخشے ہیں؟ اور اگر یہ دونوں مادّے فطرتِ انسانی میں مساوی اور بالکل مساوی ہیں، اور اُسی کے ساتھ اگر یہ بھی دُرست ہے کہ دو مساوی القوّت چیزیں ایک دوسرے کو کسی طرح مغلوب نہیں کر سکتی ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ انسان کا ایک ہموزن و مساوی القوت مادہ یعنی "شر" اُس کے دوسرے ہموزن و مساوی القُوّت مادّے یعنی "خیر" پر غالب آجاتا ہے؟

یا صورتِ حال یوں واقع ہوئی ہے کہ یہ دونوں مادّے مساوی طور پر تقسیم نہیں کیے گئے ہیں بلکہ کسی فطرت کو "خیر" کا مادہ زیادہ دیا گیا ہے، اور کسی کو "شر" کا؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہونا یہ چاہیے تھا کہ "خیر" و "شر" کی رُو سے انسانیت نِصف یا اس کے قریب تقسیم ہو جاتی، اور دونوں میں ایک معمولی سی اقلیت و اکثریت کا فرق رہتا، اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتا رہتا کہ کبھی تو اربابِ "خیر" اکثریت میں آجاتے: اور کبھی اربابِ "شر"

لیکن واقعاتِ عالم کو غور سے دیکھیے تو صورتِ حال ان دونوں صورتوں سے ہمیشہ مختلف رہی ہے یعنی انسانیت کا سوادِ اعظم ہمیشہ وابستہ "شر" ہی رہا ہے۔ اور اس لئے اس صورت سے بھی ہم اُسی ایک نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اِنسانی

فطرت کو مادۂ "خیر" کم بلکہ بہت کم، اور مادۂ "شر" زیادہ بلکہ بہت زیادہ عطا فرمایا گیا ہے اور اگر ایسا ہے تو ہمیں یہ دریافت کرنے کا بھی حق پہونچتا ہے کہ ان حالات میں انسانی افکار و کردار کی ذمہ داری کدھر جاتی ہے۔ مگر یہ سوال کم سے کم اس مقالے کے موضوعِ بحث سے خارج واقع ہوا ہے اور اس لئے سردست اس کا چھوڑنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا۔

کیا قارئین میں سے کوئی صاحب براہِ معارف نوازی اس موضوع پر مزید روشنی ڈال کر اپنے ملک کی ذہنی تربیت اور علمی خدمت میں حصہ لینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟ لیکن گذارش یہ ہے کہ مقالہ معقولی ہو، نہ کہ منقولی۔

مُردہ پرست ہندوستان

صبح کا وقت ہے، گھٹائیں کہیں کالی ہیں، کہیں بھوری، ہوائیں نرم اور ٹھنڈی ہیں۔ اور ریڈیو پر "عرض ہنر میں خاک نہیں" کی شکایت کرنے والے غالب کی غزل

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

بھیرویں کی دُھن میں گائی جا رہی ہے۔

کمرے میں عود جل رہا ہے، عُود کے مُعطّر دھوئیں میں راگنی کی ملائم لہریں رقص کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور فضا میں غالب کی رُوح

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

کا تصوّر کئے گنگناتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ اور غم میرے دورانِ خون میں کروٹیں لے رہا ہے۔

یہ وہی گلی ہے جہاں کی گلیوں میں غالب چلتا پھرتا اور:

جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

سے لُطف اندوز ہوتا تھا۔ اور آج اسی دہلی کی خاک میں سو رہا ہے۔

یہ وہی دہلی ہے جس کے سر پر اعظم ہندوستان کا زرنگار تاج جگمگاتا تھا۔ اور جس کے ذروں پر بڑے بڑوں کی پیشانیاں جھکتی تھیں۔

یہ وہی دہلی ہے جس کے حلقۂ رنگ و بو میں شباب و شعر کی بڑھتی ہوئی امنگوں کے ساتھ غالبؔ داخل ہوا تھا۔

آج غالبؔ پوجا جا رہا ہے، کل جب وہ زندہ تھا تو اسی دہلی میں اکثر وہ شیر آدھ پاؤ گوشت، اور پاؤ بھر شراب کے لئے ترستا رہتا تھا

آج غالبؔ کے دیوان کو ہندوستان کی آسمانی کتاب کہا جاتا ہے۔ کل جب وہ زندہ تھا تو اسی دہلی میں اُسے مہمل گو کا خطاب دیا گیا تھا۔ اور اُسے بار بار جگہ

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

کہنا پڑتا تھا۔

آج مُلک کے بڑے بڑے دولت مند اُس کے مزار کی "زیارت" کے واسطے آتے ہیں۔ کل جب وہ زندہ تھا تو اُسے خود اُمراء کے دروازوں پر جانا پڑتا تھا۔

آج اُس کی قبر کے لئے بڑے بڑے چندے جمع کئے جاتے ہیں۔ کل جب وہ زندہ تھا تو

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کا رونا رویا کرتا اور کرایہ کے حقیر مکانوں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور رہتا تھا۔

آج اُسے "علیہ الرحمۃ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، کل جب وہ زندہ تھا تو اسی "علیہ الرحمتہ" کو دنیا "شرابی" کے نام سے پکارتی اور لونڈوں کے پڑھانے والے "دو دو پیسے" کے مولوی اُسے "فاسق" و "فاجر" کہا کرتے تھے۔

آج اُس کی شان میں اگر کوئی اہانت کا ایک کلمہ بھی زبان سے نکال دے

تو پوری قوم اُس سے نفرت کرنے لگی جب وہ۔ قمار بازی کے الزام میں اُسے قید کرا دیا گیا تھا۔
یہ کتنی تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان اِس شدت کے ساتھ مُردہ پرست واقع ہوا ہے
جس کی نظیر نہیں مِل سکتی۔ آج بھی بوڑھا ہندوستان اپنے جوان روح اہلِ کمال کو تیکھی
نظروں سے دیکھ رہا اور اُنہیں حسبِ دستور قدیم جی بھر کے پامال کر رہا ہے۔

ہندوستان اپنے ہر صاحبِ کمال سے پُکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ او نامراد جب تک تو زندہ رہنے
کا جرم کئے جائیگا میں تجھے چین سے نہیں رہنے دونگا۔ اور جب تو ایک سعادتمند فرزند کی طرح مر کر
میری حسرت نکال دیگا تو میں اغیار کی دستبُرد سے بچا کچھا اپنا سرمایہ کمال سونا تیری لوحِ مزار پر چڑھا دونگا

ابھی کچھ دن ہوئے کہ ہز ہائی نس والیٔ بھوپال کی زیرِ صدارت حالی کی صد سالہ یادگار
بڑے طمطراق سے منائی گئی تھی۔

اگر زندگی میں حالی چاہتے کہ اپنی سالگرہ کی تقریب میں نواب صاحب بھوپال تو بڑی چیز
ہیں، صرف پانی پت کے چند کھاتے پیتے زمینداروں ہی کو جمع کر لیں تو یقین مانئے کہ دو ایک پرانی
وضع کے مقروض زمینداروں کی علاوہ بڑے زمینداروں میں سے ایک بھی شرکت کا ننگ گوارا نہ کرتا۔
اور اگر وہ اس تقریب میں بھولے سے کسی "ہز ہائینس" کو دعوت کا رقعہ بھیج دیتے تو ایک
طرف تو یہ ہوتا کہ "ہز ہائینس" کا پرائیویٹ سکریٹری اُس گستاخ دعوت نامے کو چاک کر کے ردّی
ٹوکری میں پھینک دیتا۔ اور دوسری طرف جو شخص یہ سُن پاتا کہ:-

آج حالی بھی بلاتے ہیں گھر اُن کو مہماں

تو وہ اس قدر ہنستا کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے، اور پسلیاں پھوڑے کی طرح دُکھنے لگتیں۔
مبارک ہیں ناقدر شناس و مردہ پرست ہندوستان کے وہ اہلِ کمال جو مر چکے ہیں۔ اور حیف ہے
اُن بدبختوں پر جو اس دشمنِ کمال سرزمین پر زندہ ہیں۔ اور مرنے کی آرزو میں جی رہے ہیں۔

نشہ، اور بنی نوعِ انسان

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نامِ فسق!!
داوری دارم بسے، یارب کرا داور کنم؟

نشہ، ہر اُس کیفیت کو کہتے ہیں جو خون کی رفتار کو تیز کر کے جذبات میں ایک گرمی اور اُبھار پیدا کر دے، اور سنجیدگی و بے کیفی کو سرور و نشاط کے سانچے میں ڈھال دے۔

دنیا کی تمام دوسری چیزوں کی طرح نشے کے بھی مدارج ہوتے ہیں — درجہ ادنیٰ، متوسط، اور اعلیٰ۔ لیکن تفاوتِ مدارج کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ ان مدارجِ ثلاثہ میں سے کسی ایک درجے کو نشے کی تعریف سے خارج کر دیا جائے، جس طرح ایک کم تیز دوڑنے والے کو دوسرے زیادہ تیز دوڑنے والے کے مقابلے میں ساکن و غیر متحرک نہیں کہا جا سکتا، اُسی طرح نشے کے درجۂ ادنیٰ و متوسط کو اُس کے درجۂ اعلیٰ کے مقابلے میں عدمِ نشہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا — کسی کی نیند ہلکی ہوتی ہے، اور کسی کی گہری۔ مگر سونے کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔

قدیم تعصبات کی بنا پر، لوگ، نشے کے موضوع سے غیر ہمدردانہ تیوروں کے ساتھ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ نشہ اس درجہ اہم اور ناگزیر شے ہے کہ انسان اُس کے بغیر جی نہیں سکتا۔

سوسائٹی اپنی موروثی کم فہمی کی بنا پر نشے کو صرف اُن چیزوں سے منسوب و مختیص کرتی ہے جو حکومت کے اکسائز ڈیپارٹمنٹ (محکمۂ مسکرات) سے متعلق ہوتی ہیں، مثلاً افیون، اور شراب وغیرہ

لیکن اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو پتا چل جائیگا کہ اس دُنیا کے ذرّے ذرّے پر نشے کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔

(۱) حقّہ، سگریٹ، سگار، تمباکو، پان۔ چائے اور قہوہ اگر نشہ آور نہیں تو اور ہیں کیا؟

(۲) فنونِ لطیفہ۔ سینما کھیل کود، اور سیر و سفر کے نشّی ہونے سے کون اِنکار کرسکتا ہے؟

(۳) پھولوں کی خوشبو، ہوا کی سنسناہٹ، مہروماہ کی تابندگی۔ تصوّرات کی سرخوشی حسین شکلوں اور منظروں کا نظارہ اور مطبوع صحبتوں کی شرکت۔ کیاان میں سے کوئی ایک شے بھی ایسی ہے جسے نشے سے خالی کہا جاسکے؟

(۴) بچوں کو پیار کرنا، بچھڑے ہوؤں سے ہم آغوش ہونا، اپنی تعریف سُن کر مسرّت محسوس کرنا، پُرانے قصّوں کا دوہرانا اور دلچسپ حکایات کا سُننا، کیاان سب میں نشہ نہیں پایا جاتا؟

اکثر افراد یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ جی گھبرا رہا ہے، اِس جی گھبرانے کا مفہوم آپ سمجھے؟ یعنی تھکی ہوئی رُوح، سنجیدگی سے تنگ آکر کسی نشے کا مطالبہ کر رہی ہے

آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ لوگ نیندیں حرام کئے ہوئے رات کے دو دو بجے تک گپیں اُڑا رہے ہیں۔ ورسونے کا نام تک نہیں لیتے، کیونکہ گپ سے انکو نشہ ہوتا ہے اور نشے کے سامنے وہ اُن فرائض کی پرواہ نہیں کرتے جنھیں آفتاب کے طلوع

ہونے سے پیشتر انہیں انجام ہوتیا ہے۔

اسی طرح جھوٹ کو لیجئے، جھوٹے اس یقین کے باوصف کہ لوگ اُن کی بات کا اعتبار نہیں کرتے، اور انہیں انتہا درجے کا جُھوٹا سمجھتے ہیں۔ جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتے۔ وہ جھوٹ بولتے اور دھڑلّے کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ جھوٹ ان کا نشہ ہوتا ہے اور کوئی شخص نشے سے باز نہیں رہ سکتا۔

ایک بخیل جب روپے گِنتا اور ایک مُسرف جب خرچ کر رہا ہوتا ہے، آپ اگر ان دونوں کا غائر مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ اس وقت طبعی حالت میں نہیں بلکہ نشہ میں سرشار ہوتے ہیں۔

انسان کے رنگین مشاغل سے قطع نظر کرکے کہ ان کی سکر آفرینی تو بدیہات میں سے ہے۔ آپ اگر ان مشاغل و اعمال کو پرکھیں جنھیں انتہائی سنجیدہ، اور مقدس سمجھا جاتا ہے تو یہ معلوم کرکے آپ کو تعجب ہوگا کہ وہ بھی نشہ اور سراسر نشہ ہی ہوتے ہیں۔

مطالعہ کتب ہو کہ اخبار بینی، ایجاد و اختراع کا انہماک ہو کہ تفکر و تدبر کا استغراق اور اوراد و وظائف ہوں کہ ذاکری و میلاد خوانی، مضمون نویسی ہو کہ خطابت، علمی مباحثہ ہو کہ مذہبی مناظرہ۔ موعظت و قرأت ہو کہ مکاشفہ و مراقبہ۔

ان تمام مشاغل و اعمال کی دیدہ ریزی کے ساتھ تحلیل کی جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جائے گی کہ یہ سنجیدہ و مقدس اعمال بھی نشے کے حدود سے ایک انچ باہر نہیں ہوتے۔

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ لوگ جب وقت کسی روحانی مطالعے میں ... یا کسی روحانی قرأت میں مشغول ہوتے ہیں، تو ان کی آنکھوں اور اُن کے چہروں ...

میں نشہ کھیلتا ہوا نظر آتا ہے؟

اس کے دوش بدوش اب میں وہ بات عرض کرتا ہوں جسے سنکر آپکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہیگی۔ اور آپ نشے کے عالمگیر استیلاء کو دیکھکر دنگ رہ جائیں گے۔ یعنی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ رامش و رنگ اور رقص و سرود ہی میں نشہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ظالم نشہ ٹھنڈی آہوں اور گرم آنسوؤں تک میں بھی لہریں لیتا رہتا ہے۔ عطّار اگر:-

"ذرہ دردے دِل عطّار را"

اور میر:-

مزا اگر مزا ہے تو پچھلے پہر کے رونے میں"

کا نعرہ لگاتا ہے، تو اِس کے معنی اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتے ہیں کہ سوزِ دل اور... اشک غم" بھی نشے ہی کے دوش بدوش نام ہیں۔

اب آپ سمجھے کہ نشے کا دائرہ کتنا لا محدود اور نشے کے اقسام کتنے بیشمار واقع ہوئے ہیں؟

اِن حالات میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ نوعِ انسانی کو حیات کی ہر منزل اور زندگی کے ہر قدم پر نشے کی ضرورت اور شدید ضرورت لاحق ہوتی ہے اور ہر فرد اس دنیا میں کسی نہ کسی نشے کا ایسا خوگر ہوتا ہے کہ اس کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔ تو اِس حقیقت کبریٰ کے تسلیم کرنے میں کس کو تامل ہو سکتا ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ انسان ازلی قدح خوار اور ابدی شرابی واقع ہوا ہے تو کس کی مجال ہے کہ انکار کر سکے؟

ہاں میں اعلان کروں گا۔ اور:-

گرچہ بہ دا عنیاِ شہر ایں سخن آساں بنود

ڈنکے کی چوٹ اعلان کروں گا کہ یہ عظیم المرتبت و محسنِ بنی نوعِ انسان نشۂ اعظم ہی ہے جو حیاتِ انسانی کے ٹوٹے ہوئے سفینے کو حوادث کے ہولناک طوفانی سمندروں میں سرشاری و مستی کے ساتھ کھیلتا ہوا ساحلِ مراد تک پہونچا دیتا ہے۔ اور آلام کی سنگ باریوں کا مقابلہ کرنے کی خاطر، زندگی کے شیش محل پر لالہ و گل کا ایک ایسا رنگین سائبان تعمیر کر دیتا ہے کہ دردمندِ انسانیت اُس کی خنک چھاؤں میں میٹھی نیند سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔

سرم خوش است و بیانگِ بلند می گویم
کہ من نسیمِ حیات از پیالہ می جویم

ایک سُوال

سُوال یہ ہے کہ کونسا طبقہ ہندوستان کے کام آسکتا ہے؟

(۱) کیا گریجویٹ کام آسکتے ہیں؟

نہیں۔ اور گو بختی ہوئی "نہیں"

یہ ٹائیاں باندھنے والے نیم فاقہ کش

یہ دفتر کا دروازہ کھٹکھٹاتے والے گداگر۔

یہ پوڈر اور لونڈر کے عاشقانِ نامراد۔

یہ آدھے تیتر آدھے بٹیر، جو نہ مشرقی ہی ہیں نہ مغربی۔

یہ بہروپئے۔ یہ سند یافتہ بھلا۔ یہ غریب خود اپنا پیٹ تو پال نہیں سکتے۔

ہندوستان کی کیا مدد کرسکیں گے؟

(۲) کیا لیڈر کام آسکتے ہیں؟

نہیں۔ ہزار بار نہیں۔ شیروں کی طرح ہو نکتی ہوئی "نہیں"

یہ خطابوں، عہدوں اور خفیہ وظیفوں کے درپردہ اُمیدوار۔ یہ نام و نمود کے بھکاری

یہ حُبِ جاہ کے فرزندانِ رشید یہ لفظ "قوم" سے صرف اپنی ذات" مُراد لینے والے۔

اُنہیں اپنی تعمیر سے کب فرصت ہے کہ ہندوستان کی فکر کرسکیں گے؟

(۳) کیا وکلاء اور بیرسٹر کام آسکتے ہیں؟

نہیں، ہرگز نہیں۔ اور گرجتی ہوئی "نہیں"

یہ چھوٹی چھوٹی دوکانوں پر "پلیڈر" اور "ایڈوکیٹ" کے بورڈ لگانے والے یہ دو دو روپے کے پیچھے دوڑنے والے۔ یہ صبح سے شام تک مؤکلوں کی راہ دیکھنے والے۔ یہ روزی کے واسطے بوکھلائے ہوئے دبلے پتلے انگریز۔

انھیں عدالتوں کے طواف سے کب فرصت ہے کہ ہندوستان کے واسطے کچھ کرسکیں گے؟

(۴) کیا سرکاری ملازم کام آسکتے ہیں؟

بیشک سرکاری آدمی، اگران کا بس چلے تو ہندوستان کو کم سے کم قید حیات سے تو ضرور آزادی دلا سکتے ہیں۔

(۵) کیا امرا کام آسکتے ہیں؟

کیوں نہیں۔

یہ گھگلے، گاودی اور پلپلے۔ یہ بزاسیر و بدہضمی کے صید زبوں۔ یہ خوشامدوں کے پروردہ۔ جہالت کے نور نظر۔ مسخروں کے ان داتا۔ اپنی اپنی ریاستوں کے جال میں پھڑکنے والے زاغ و زغن۔ یہ موٹروں اور مہریوں کی لاشیں۔ یہ مزاج کے پارہ۔ طبیعت کے آوارہ۔ جن کی عقلیں ہاتھی کی سونڈ کی طرح موٹی، اور جن کے ذہن سارس کی ٹانگوں کی طرح دبلے ہیں۔ یہ سورما تو ضرور کام آسکتے ہیں۔

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری!

(۶) کیا علمائے کرام، اور صوفیائے کبار کام آسکتے ہیں؟

جی ہاں کیوں نہیں۔

یہ دوسروں کی گاڑھی کمائی کے حلوے کھانے، اور پرائی مٹھائیاں چھکنے والے مذہبیے۔ یہ عبا و قبا میں لپٹی ہوئی متعفن لاشیں۔ یہ حق سے بھاگنے اور باطل کو آغوش میں لینے والے مقدس ڈاکو۔ یہ غداری سے سازباز رکھنے والے روحانی اوتار جن کی ڈاڑھیوں اور مرطوب چھاؤں میں شیطان رات کا کھانا کھاتا ہے۔ یہ خدا کو فروخت اور پیمبر کو نیلام کرنے والے کباڑیے —— یہ حوروں کے کمیشن ایجنٹ اور یہ غلاموں کے دلال۔

اگر یہی ہندوستان کی رہبری نہ کریں گے تو پھر کون کرے گا؟

(۷)

کیا ملک کے تجربہ کار پیران کہن سال کام آسکتے ہیں؟

غضب خدا کا بوڑھے اور جوان خواب!

یہ تھرتھراتی ہمتوں کی گرتی ہوئی دیواریں —— یہ آنکھوں سے کیچڑ چھینتی ہوئی زندہ آہیں —— یہ زمانے کے شدائد سے ہزار بار معافی مانگے ہوئے بزدل —— یہ اوہام کے قبرستان کی قیشارے۔ تعصب کے پہاڑ۔ مذہب کے دیوالنے۔ رسوم کی ہڈیوں پر لڑنے اور گھٹے باجے پر ٹوٹے ٹیپ دینے والے پرانے گدھ۔

یہ پہلے خود تو جی لیں، ہندوستان کو کیا جلا سکیں گے؟

(۸) کیا ایڈیٹر کام آسکتے ہیں؟

ہندوستان کے ایڈیٹر؟

یہ امراء کو دھمکا دھمکا کر روپے اینٹھنے والے کاغذی ڈاکو۔ یہ ہندو مسلم نفاق کے

شاید کوئی عبرت حاصل کرے

ہندوستان میں جہاں اور بدبختیاں ہیں وہاں ایک بہت بڑی بدبختی یہ بھی ہے کہ گھر کا ایک آدمی کماتا ہے اور باقی تمام ارکان اُس کے سر کھاتے ہیں اور جب وہ کمانے والا مر جاتا ہے تو اس کے سہارے زندگی بسر کرنے والے بھیک مانگنے لگتے ہیں۔

یہ وبا صرف اہل خاندان ہی تک محدود نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر کمانے والے سے اس کے دوست، احباب بھی وابستہ ہوتے ہیں جو اُسی کا رزق کھاتے اور اسی کا کپڑا پہنتے ہیں۔ اس قسم کے تمام افراد کی عبرت کے لئے ذیل کا تاریخی واقعہ درج کیا جاتا ہے اگر اس سے تمام ملک میں عبرت و نصیحت حاصل کر کے اپنے دست و بازو سے کمانا شروع کر دیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی۔

ایک وحشی عرب نے اپنے اونٹ کی ایک خورجی میں غلّے کی ایک کثیر مقدار رکھی۔ اور دوسری خورجی میں صرف دو ایک برتن اور تھوڑا سا کھانے پینے کا سامان رکھ کر سفر کے لئے روانہ ہو گیا۔

غلّے کی خورجی بھاری ہونے کی وجہ سے بار بار نیچے کی طرف سرک جاتی تھی، اور عرب بڑبڑاتا ہوا اونٹ سے نیچے اُترتا اور اُسے درست کر کے پھر حل کھڑا ہوتا تھا۔

وہ خورجیوں کے اس عدم توازن سے نہایت تنگ تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ

آتا تھا کہ اِس بَلا سے کیونکر نجات حاصل کرے۔

اِتنے میں اسے ایک راہرو ملا جو کاندھے پر گٹھڑی لادے ہوئے پیادہ سفر کر رہا تھا۔ اور اس کی طرف دیکھ دیکھ کر برابر مسکرا رہا تھا۔

چنانچہ دونوں میں یوں گفتگو شروع ہوئی۔

شُتر سوار عرب۔ تم مجھے دیکھ کر کیوں مسکرا رہے ہو، کیا تم میری تلوار کی دھار سے واقف نہیں؟

پیادہ عرب۔ نہیں بھائی میں تمہاری تلوار کی دھار سے بخوبی واقف ہوں لیکن ....

شُتر سوار عرب (تلوار سونت کر) "لیکن" کیا؟

پیادہ عرب۔ (جھجک کر) برادر! میں تمہارا بہی خواہ ہوں، اور چاہتا ہوں کہ تمہاری تکلیف کو دُور کردوں۔

شُتر سوار عرب۔ اس کے کیا معنی ہیں؟

پیادہ عرب۔ آپ کی ایک طرف کی خورجی بار بار نیچے کی طرف سرک جاتی ہے، جس سے آپ کو بار بار اونٹ ٹھیرانے اور اُسے دُرست کرنے کی تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے اجازت دیجے کہ میں اسے دُرست کردوں۔

شُتر سوار عرب۔ تم کیونکر دُرست کردوگے؟

پیادہ عرب۔ میں دونوں خورجیوں کا وزن برابر کردوں گا۔ اور جب دونوں کا وزن برابر ہوجائے گا تو پھر آپ کو خورجیوں کے برابر کرنے کی تکلیف ایک بار بھی نہیں اٹھانا پڑے گی۔

شتر سوار عرب۔ تم ہات نہ لگاؤ مجھے تبلاتے جاؤ میں خود اپنے ہات سے یہ کام کرلوں گا۔

لیکن یاد رکھو اگر اس کے بعد بھی مجھے وہی تکلیف ہوئی تو میں تمہارا سر قلم کردوں گا۔

اس کے بعد شتر سوار عرب اترا اور پیادہ عرب کی ہدایت کے مطابق دونوں خورجیوں کو مساوی الوزن کر دیا۔

شتر سوار عرب۔ آؤ، تم میرے ساتھ آؤ، راستے میں اگر مجھے پھر وہی تکلیف ہوئی تو تمہارا سر کاٹ لوں گا۔ اور اگر تکلیف نہ ہوئی تو جہاں کہوگے میں اپنے اونٹ پر تمہیں پہونچا دوں گا۔

چنانچہ پیادہ عرب بھی اونٹ پر سوار ہوگیا۔ شتر سوار نے جانچنے کی خاطر اونٹ کو بہت تیز دوڑایا، اور کئی میل تک برابر دوڑاتا رہا۔ لیکن اُسے اس تکلیف کا دوبارہ سامنا نہیں ہوا۔ جس سے خوش ہوکر اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

شتر سوار۔ تم نہایت عقلمند آدمی معلوم ہوتے ہو۔

ساتھی۔ میں تمام درسی کتابیں پڑھ چکا ہوں۔

شتر سوار۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ تم بہت کچھ کماتے ہوگے۔ تمہارے پاس دولت کی کمی نہ ہوگی۔

ساتھی۔ نہیں۔ میں کچھ نہیں کماتا، میرے قدردان میرا پیٹ بھر دیتے ہیں۔

شتر سوار۔ (غصے سے سُرخ ہوکر) تم کچھ نہیں کماتے۔ تم دوسروں کے سہارے جیتے ہو۔ واللہ اگر علم کے یہ معنی ہیں کہ انسان ہات پاؤں نہ ہلائے اور خیرات پر زندگی بسر کرے تو اس سے جہالت کہیں بہتر ہے۔

اتنا کہہ کر شتر سوار ٹھیر گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ غصّے کو ضبط کر رہا ہے لیکن
تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے بال نوچ نوچ کر کہنے لگا۔

"بطّال! تو میرے اونٹ سے اُتر جا، مجھے نہ تیری عقلمندی کی ضرورت
ہے نہ علم کی۔"

یہ کہہ کر وہ اونٹ سے کود پڑا، اپنے ساتھی کو بھی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیا اور جس طرح
کہ پہلے ایک ہی خورجی میں تمام غلّہ بھرا ہوا تھا اُسی طرح بھر کر اپنے اونٹ پر یہ کہتا
ہوا روانہ ہو گیا کہ ایک نہ کمانے والے بطّال کی عقلمندی پر عمل کر کے راحت
اُٹھانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ میں ایک کمانے والے کی بیوقوفی سے تکلیف
اُٹھاتا ہوا سفر کروں۔

